معارف

اگست ۲۰۱۵ء

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

سالانہ زرتعاون

ہندوستان میں سالانہ ۲۸۰/روپئے۔ فی شمارہ ۲۵/روپئے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۴۸۴/روپئے

دیگر ممالک میں سادہ ڈاک ۱۶۶۰/روپئے۔ دیگر ممالک رجسٹرڈ ڈاک ۱۷۸۰/روپئے

ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۳۰۰/روپئے میں دستیاب۔

(اوپر کی رقوم ہندوستانی روپئے میں دی گئی ہیں)

پاکستان میں ماہنامہ معارف کے لئے رابطہ کریں

سجاد الٰہی صاحب، 27-A لوہا مارکیٹ، مال گودام روڈ، بادامی باغ، لاہور (پاکستان)

Tel: 0300 - 4682752, (R) 5863609, (O) 7280916

Email: abdulhadi_133@yahoo.com

سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں۔

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

- زرتعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کر دیا جائے گا۔
- معارف کا زرتعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
- خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
- کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

مقالہ نگار حضرات سے التماس

- مقالہ صفحہ کے ایک طرف لکھا جائے۔
- حواشی مقالے کے آخر میں دیئے جائیں۔
- مآخذ کے حوالہ جات مکمل اور اس ترتیب سے ہوں: مصنف یا مؤلف کا نام، کتاب کا نام، مقام اشاعت، سن اشاعت، جلد یا جز اور صفحہ نمبر۔

عبدالمنان ہلالی (جوائنٹ سکریٹری/منیجر) نے معارف پریس میں چھپوا کر
دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۱۹۶ ماہ شوال المکرم ۱۴۳۶ھ مطابق ماہ اگست ۲۰۱۵ء عدد ۲

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

فہرست مضامین

شذرات

استشراق کی تحریک مغربی استعمار کے بطن سے پیدا ہوئی۔ چنانچہ استعماریت کی تقویت اور مشنری سرگرمیوں کی توسیع ابتدا ہی سے اس کے اساسی مقاصد میں شامل رہے ہیں۔ اس کا خمیر اسلام دشمنی سے اٹھایا گیا تھا جس کے ڈانڈے صلیبی جنگوں بلکہ اس سے بھی بہت پہلے عیسائی علاقوں کی اسلامی فتوحات سے جا ملتے ہیں۔ اس کا ہدف یوں تو بحیثیت مجموعی اسلام ہے لیکن قرآن مجید شروع ہی سے مستشرقین کی دلچسپیوں اور عنایات کا خاص مرکز رہا ہے۔ عہد حاضر کے حالات کے مخصوص تناظر میں اس مقدس کتاب کے خلاف ان کی معاندانہ سرگرمیوں میں غیر معمولی حد تک تیزی اور تندی آ گئی ہے۔ وہ اسلامی نظام حیات میں قرآن مجید کی مرکزی حیثیت سے آگاہ ہیں اور انہیں یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ اگر وہ کسی طرح مسلمانوں کے دل و دماغ میں کتاب عزیز کے بارے میں شکوک و شبہات کی آبیاری میں کامیاب ہو جائیں تو یہ عظیم الشان عمارت خود بخود خاک بوس ہو جائے گی اور اس کے لیے کسی مزید تگ و دو کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اس کے علاوہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جن اقوام کو مغربی استعمار سیاسی اور عسکری حیثیت سے زیر کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا ہے وہ بھی مغربی تہذیب کے آگے سرنگوں ہو چکے ہیں۔ اسلامی دنیا میں مغربی تہذیب کے مکمل تسلط کی راہ میں یہی کتاب اور اس کی تعلیمات حائل ہیں۔ کسی اور فلسفہ حیات اور نظام کائنات میں مادیت کے اس ہمہ گیر طوفان کو روکنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ اس رکاوٹ کو وہ بہرصورت دور کرنا چاہتے ہیں اور صدیوں سے اس کے لیے منصوبہ بندی کرتے رہے ہیں۔

عام طور پر مستشرقین کا یہ موقف رہا ہے کہ قرآن مجید نعوذ باللہ حضور رسالت مآب ﷺ کی تصنیف ہے جس کا بیشتر حصہ یہودی اور عیسائی مآخذ سے مستفاد اور مستعار ہے۔ قرآن مجید کے نزول، تدوین اور حفاظت کی مستند اور نہایت روشن تاریخ ان کے نزدیک قابل اعتماد نہیں۔ عہد حاضر میں بعض زیادہ پرجوش مستشرقین کے جذبہ عناد کی اس سے بھی تسکین نہیں ہو سکی اور ان کے زرخیز دماغ نے ایک اور افسانہ اختراع کر ڈالا۔ ان کی ''تحقیقات'' کی رو سے قرآن مجید تنہا رسول اللہ ﷺ کی بھی تصنیف نہیں ہے بلکہ اس کو حتمی شکل دینے میں مسلمانوں کی کئی نسلوں کی کوششیں شامل ہیں۔ ان کے خیال میں یہ کام تین صدیوں میں مکمل ہوا۔ اس طرح قرآن مجید دو الگ الگ حصوں پر مشتمل ہے جو ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہیں۔ ایک حصہ تو وہ ہے جسے ابتدائی قرآن کہا جا سکتا ہے جو ان عیسائی نظریات و تعلیمات سے ماخوذ ہے جو عرب میں عام طور سے معروف تھے۔

اسے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ باقی حصوں کا تعلق بعد کے زمانہ سے ہے اور یہ مسلمانوں کی کئی نسلوں کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔

اس پس منظر میں برمنگھم یونیورسٹی کی کیڈبری ریسرچ لائبریری کے منگانا کلکشن (Mingana Collection) میں قرآن مجید کے ایک قدیم نسخہ کے اوراق کی دریافت بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ دنیا کی مختلف لائبریریوں اور ذاتی ذخیروں میں قرآن مجید کے متعدد نہایت قدیم نسخے موجود ہیں۔ اب یہ اوراق بھی ان میں شامل ہوگئے ہیں۔ اس بات کا بھی امکان ہے کہ یہ نسخہ سب سے قدیم ہو۔ یہ اوراق تقریباً گذشتہ ایک صدی سے لائبریری میں موجود تھے لیکن اب تک کسی نے ان کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ وجہ غالباً یہ تھی کہ یہ اوراق کسی دوسری کتاب کے ساتھ منسلک تھے اور ان کو اسی کتاب کا حصہ سمجھا جاتا رہا۔ لائبریری کے ذمہ داروں کو بھی اس کا اندازہ نہیں تھا کہ ان کی تحویل میں اتنا قیمتی خزانہ موجود تھا۔ Alphonse Mingana ایک کلدانی پادری تھا جو ۱۸۷۸ میں عراق میں پیدا ہوا۔ بعد میں وہ برمنگھم منتقل ہوگیا۔ کیڈبری چاکلیٹ کمپنی کے مالکان میں ایڈورڈ کیڈبری (۱۸۷۳-۱۹۴۸) ایک علم دوست شخص تھا۔ اس نے منگانا کو نایاب علمی ذخائر کی تلاش میں عراق بھیجا۔ منگانا نے اس علاقہ سے بہت سے اہم مخطوطات حاصل کیے۔ ان میں یہ نایاب اوراق بھی شامل تھے جن کی قدر و قیمت کا اندازہ اس وقت نہیں کیا جاسکا۔ اب یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں کہ یہ اوراق منگانا نے کہاں سے حاصل کیے۔ اس دریافت سے علمی دنیا میں بڑی ہلچل ہے۔ مسلمانان عالم کو اس دریافت سے فطری طور پر بڑی خوشی ہوئی ہے۔ ۲/اکتوبر سے ان اوراق کو باربر انسٹی ٹیوٹ آف فائن آرٹس میں نمائش کے لیے رکھا جائے گا جہاں لوگ ان کی زیارت سے بہرہ ور ہوسکیں گے۔

جب ان اوراق کی ریڈیو کاربن ڈیٹنگ کا فیصلہ کیا گیا تو یہ بات کسی کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں تھی کہ یہ اتنے قدیم اور اتنی اہمیت کے حامل ہوسکتے ہیں۔ یہ تجربہ آکسفورڈ یونیورسٹی کے Radiocarbon Accelerator Unit میں کیا گیا۔ جب اس کے نتائج سامنے آئے تو علمی دنیا حیرت زدہ رہ گئی۔ اس تجربہ سے حاصل ہونے والے نتائج کے مطابق یہ قرآنی آیات بکری یا بھیڑ کی کھال پر حجازی رسم الخط میں لکھی گئی ہیں جو ابتدائے اسلام میں رائج تھا۔ تحریر صاف، واضح اور خوبصورت ہے اور آسانی سے پڑھی جاسکتی ہے۔ اس کا تخمینی زمانہ ۵۶۸ اور ۶۴۵ سن عیسوی کے درمیان ہے۔ ان تاریخوں کی صحت کا پیمانہ 95.4 ہے یعنی تقریباً صد فی صد۔ یہ عرصہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حیات طیبہ، سیدنا ابوبکرؓ اور سیدنا عمر فاروقؓ کی خلافت کے عہد مسعود

پر مشتمل ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اوراق حضرت عمرؓ کی خلافت کے اختتام سے پہلے لکھے جا چکے تھے۔ اس بات کا بھی امکان ہے کہ یہ آنحضرتؐ کی حیات مبارکہ میں لکھے گئے ہوں ۔اس صورت میں اسے قرآن مجید کے قدیم ترین موجود نسخہ ہونے کا اعزاز حاصل ہوگا۔زیادہ امکان یہی ہے کہ اس کے کاتب کوئی صحابی ہوں ۔گویا برمنگھم یونیورسٹی کی لائبریری میں ایک ایسا خزانہ محفوظ ہے جس کی قدرو قیمت کا اندازہ بھی لگانا مشکل ہے۔ان اوراق پر سورہ ۱۸۔۲۰ کی آیات لکھی ہوئی ہیں اوران کے الفاظ بعینہٖ وہی ہیں جو قرآن مجید میں ہیں۔ہم مسلمانوں کے لیے تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں۔ہمارا ایمان ہے کہ آج جو قرآن ہمارے ہاتھ میں ہے وہ بعینہٖ وہی ہے جو ہمارے رسولؐ پر نازل ہوا تھا اور اس کی محفوظیت کا یہ عالم ہے کہ اس میں ایک حرف اور ایک شوشہ کا بھی فرق نہیں آیا ہے۔البتہ یہ ان معاندین اور متشککین کے لیے تازیانہ عبرت ہے جو نہ صرف محفوظیت قرآن پر طرح طرح کے سوالات اٹھاتے رہتے ہیں بلکہ نعوذ باللہ اس میں تحریف کی داستان بھی دہراتے رہتے ہیں ۔لیکن کیا اس سے یہ مسئلہ حل ہوجائے گا اور معاندین روز روشن کی طرح اس واضح اور ناقابل انکار حقیقت کو تسلیم کرلیں گے۔ہمیں اس میں بہت شبہ ہے۔نزول قرآن کے زمانہ کے معاندین کا تو یہ حال تھا کہ:

وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا (انعام:۲۵) اگر وہ ہر قسم کی نشانیاں دیکھ لیں گے تو بھی ایمان نہیں لائیں گے۔

زیادہ امکان یہی ہے کہ اِس زمانہ کے معاندین بھی یہی انداز اختیار کریں گے۔ریڈیو کاربن ڈیٹنگ جو قدیم اشیاء کی عمر متعین کرنے کا ایک اسٹینڈرڈ سائنٹفک طریقہ ہے اس کی معتبریت پر سوال اٹھائے جائیں گے۔رسم الخط سے متعلق طرح طرح کے مباحث چھیڑے جائیں گے اور کسی نہ کسی طرح سے اسے زمانہ مابعد کا واقعہ ثابت کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

البتہ یہ امکان بہر حال موجود ہے کہ اس سلسلہ میں خالص علمی بنیادوں پر ایسے سوالات اٹھائے جائیں جن سے ان اوراق کی قدامت معرض بحث میں آجائے۔یوں بھی اس سلسلہ میں اس وقت تک کوئی حتمی بات کہنا ممکن نہیں ہے جب تک تمام اوراق سامنے نہ آجائیں اور کھال کے علاوہ اس تحریر میں استعمال ہونے والی روشنائی کی بھی پوری طرح جانچ نہ ہوجائے۔اس امکان کو یکسر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ کھال تو اتنی ہی قدیم ہو لیکن اس پر لکھی جانے والی تحریر اتنی قدیم نہ ہو۔اب دیکھنا یہ ہے کہ اس سلسلہ میں مختلف علمی حلقوں کی طرف سے کیا رد عمل سامنے آتے ہیں۔

مقالات

تہذیب قوم ادریسؑ

معدوم تہذیبوں کی تاریخ پر زیر قلم کتاب کا ایک باب

جناب محمد طارق غازی

قرآنی زاویۂ نظر سے تاریخ کا مطالعہ انسان کی اس خوش فہمی کا پردہ چاک کرتا ہے کہ زمین پر انسانی وجود کی لاکھوں سال کی مدت میں آدمی کبھی بھی سائنسی ترقی کے اس مقام تک نہیں پہنچا تھا جہاں صنعتی انقلاب کے بعد آج وہ خود کو پاتا ہے۔ ایسے شواہد بکثرت پائے جاتے ہیں کہ انسان بار بار ترقی کی اس منزل بلکہ اس سے بھی زیادہ بلندی تک پہنچ کر زوال کی ان گہرائیوں میں اترتا رہا ہے جہاں اس کی بے مثال مادی ترقیوں کے آثار بھی ذہنوں کی تاریکیوں میں دفن ہوجاتے ہیں۔

كَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْكُمْ قُوَّةً وَّاَكْثَرَ اَمْوَالًا وَّ اَوْلَادًا (التوبۃ ۹: ۶۹)	ایسی (قومیں) تم سے پہلے ہوچکی ہیں جو شدت قوت اور کثرت اموال و اولاد میں تم سے بھی زیادہ تھیں۔

سائنس سے جو بھی کچھ ہمارے ذہنوں میں آتا ہے اس کا آغاز حضرت آدمؑ کے زمین پر آنے کے فوراً بعد ہوگیا تھا۔ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ آخر انہیں علم الاسماء دیا گیا تھا۔ ان کی ایجادیں اسی علم اسماء کے مظاہر تھیں۔ انہوں نے ہل ایجاد کیا۔ گندم اور کپاس کی کھیتیاں لگائیں۔ سوت کاتنے اور کپڑا بننے کا فن ایجاد کیا اور گیہوں کو پیس کر اس کے آٹے سے روٹی پکائی۔ پہیہ کی ایجاد بھی انہی سے منسوب ہے۔ یہ سب ابتدائی سائنس تھی۔

البتہ دنیا کی سب سے پہلی سائنسی تہذیب کے بانی حضرت ادریسؑ تھے۔ وہ بیک وقت

ڈائریکٹر: اُمم سٹڈیز ہاؤس (USH)۔ ٹورانٹو۔ کینڈا

ایک جلیل القدر اور صاحب کتاب وشریعت رسول اور ایک عبقری سائنسی موجد تھے۔ اولاد آدم میں وہ پہلے تھے جن کی شخصیت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کی دونوں فردوسی صفات کو بدرجہ اتم موثر کر دیا تھا۔ انہیں مادی علم الاسماء میں بھی کامل ایجادی دست گاہ حاصل تھی اور رسول کی حیثیت سے صحیفوں کی صورت میں کل عالم انسانیت کے لیے علم شریعت بھی عطاء کیا گیا تھا۔ ان دونوں مادی اور روحانی علوم میں مہارت کا مقصد یہ تھا کہ شریعت کی راہ سے روحانی اور معاشرتی دونوں اعتبار سے وہ انسانوں کی تربیت کریں اور مادی ایجادات کے ذریعہ معاشرتی مفاد کے تہذیبی اصول قائم کریں۔ ادریسی امتزاج علوم کے اس حوالہ سے جب انسانی تہذیبوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو ان تہذیبوں کی تمام تر خوبیاں اور خامیاں اور ان دونوں معاشرتی کیفیات کے اسباب وعلل بیک نظر سامنے آجاتے ہیں نیز تہذیبوں کے عروج وزوال اور وجود وعدم اور مہذب قوموں کی زیست و موت کا قدرتی اصول عقل ونگاہ پر ہویدا ہوجاتا ہے۔

تہذیب انسانی اپنی اصل میں تباہ کن نہیں ہوتی، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ آدمی بدنظمی اور تباہی سے بچنے کے لیے ہی تو تہذیب بناتا ہے اور تمدن کی تعمیر کرتا ہے۔ بے شک یہ دنیا انسان کا دائمی گھر نہیں ہے مگر عارضی قیام گاہ میں بھی آدمی کچھ ہنگامی راحت کا تو طلب گار ہوتا ہے۔ اسی کا نام تہذیب ہے۔ تہذیب کا تقاضا ہے کہ انسان شکر گزار ہو۔ اور شکر گزاری کے لیے بنیادی ضرورت نعمت اور احسان کی ہے۔ بلا نعمت کے شکر کا تصور نہیں پیدا ہوتا۔ اس دنیا میں اللہ کی بے شمار نعمتیں ہیں جو انسان کو بطور احسان دی گئی ہیں۔ ان نعمتوں سے انسان فائدہ اٹھائے گا تو شکر گزاری پیدا ہوگی۔ اور اس کا حکم بھی ہے۔ مگر شکر گزاری کا سلیقہ شریعت سے آتا ہے۔ اسی کو قرآن حکیم میں فرمایا گیا کہ

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّکُمْ لَئِنْ شَکَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّکُمْ وَلَئِنْ کَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِیْ لَشَدِیْدٌ (ابراہیم ۱۴:۷)	جب آپ کے رب نے اعلان کیا کہ اگر تم شکر کروگے تو تم کو زیادہ نعمتیں دوں گا، اور اگر کفران نعمت کروگے تو (سمجھ رکھو) میرا عذاب بڑا سخت ہے۔

یہ دنیوی انعامات کا تذکرہ ہے جو شکر گزاری کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ رسول اللہؐ کی ہجرت کے

بعد ایک مدت تک صحابہؓ شدائد دنیا جھیلتے رہے۔ وہ کئی کئی وقت فاقے کرتے تھے، بھوک کی شدت میں پیٹ پر پتھر باندھ لیتے تھے۔ مگر وہ دنیا کی بہترین شکر گزار نسل تھی۔ پھر اسی نسل پر دنیوی انعامات کی بارش ہوئی، مگر مال و دولت کی کثرت بھی ان کی شکر گزاری کو مضمحل نہ کر سکی یہاں تک کہ چند ہی نسلوں بعد الف لیلہ جیسے عیش کی فراوانی کے قصے تصنیف ہو گئے۔ دوسری طرف اس عالم فقر میں بھی رسول اللہؐ کی ہدایت تھی کہ دیکھو

ان اللہ یحب ان یری اثر نعمتہ علی عبدہ — اللہ کو پسند ہے کہ اپنی نعمتوں کا اثر بندہ پر دیکھے۔
(سنن ترمذی، کتاب الادب ۹۴۳/۳، ح ۲۸۱۹)

اس حدیث کی شرح میں حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیبؒ نے لکھا ہے کہ ''ڈھنگ کا کھانا اور ڈھنگ کا پہننا ہو، پھٹے حال سے نہ رہے، خراب خستہ حال نہ رہے۔ یعنی منشائے خداوندی یہ ہے کہ نعمت دی جائے تو اس کا اثر بھی بدن کے اوپر آنا چاہیے'' (خطبات حکیم الاسلام ۱:۱۱۸)۔ اسی کیفیت کے اجتماعی معاشرتی اظہار کا نام تہذیب ہے اور یہ نکتہ بھی تمام انبیاء کی شریعت کا حصہ رہا ہے جسے شرعی اصطلاح میں اوامر و نواہی کے عنوان سے پہچانا جاتا ہے۔ اوامر و نواہی کا عمرانی مقصد روحانی، بدنی اور معاشرتی تہذیب سازی ہی ہے۔

تہذیب سازی میں انبیاء کا کردار: مسئلہ وہاں پیدا ہوتا ہے جب انسان تہذیب کو فقط مادی آسائش میں محدود کر کے شکر گزاری سے غافل ہو جاتا ہے اور اس کی سرشت میں موجود فساد اور بغاوت کا عنصر اس کی تباہی کا سبب بن جاتا ہے۔ اسی لیے اچھے انسان ایک کے بعد دوسری اور پھر تیسری تہذیب بنانے پر مامور رہتے ہیں اور برے انسان کئی نسلوں کی اس محنت کو برباد کرتے رہتے ہیں۔ ڈیڑھ ہزار سال پہلے تک تہذیب سازی کا یہ عمل جن انسانوں کی نگرانی میں ہوتا تھا انہیں عرف عام میں انبیاء کا لقب دیا گیا تھا۔ ڈیڑھ ہزار سال پہلے اچھے انسانوں کی اس نوع کی آخری اور سب سے عظیم شخصیت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تہذیب انسانی کا ایک دائمی نقشہ بنا کر اور تہذیب اعتدال کی بنیاد رکھ کر وہ نمونہ پیش کر دیا تھا جس پر انسان عمل کرتا رہے تو ایک طرف دنیا میں اس کا نصیب (القصص ۲۸:۷۷) فی الدنیا حسنہ بن جائے گا اور دوسری طرف فی الآخرۃ حسنہ (البقرہ ۲:۲۰۱) کا انعام اسے حاصل ہوگا۔ اس طرح انسان اس دنیا میں ایک معتدل اور

متوازن زندگی کی ضمانت حاصل کرلے گا اور دوسری طرف آخرت کی دائمی زندگی کی بہترین نعمتوں کا مستحق بن جائے گا۔ یہی تہذیب کا منشاء ہے۔

رسولؐ اللہ فن تعمیر سکھانے کے لیے نہیں آئے تھے، مگر مسجد قبا اور مسجد نبوی اپنے ہاتھوں سے تعمیر کیں۔ رسولؐ اللہ روحانی امراض کے علاج کے لیے آئے تھے مگر بدنی امراض کے علاج پر بھی آپ کی حدیثوں کا وافر ذخیرہ ہے۔ یہ دو مثالیں ثبوت ہیں کہ روحانی تربیت کے ذریعہ انبیاء اپنی قوموں کو ایک معتدل مہذب دنیاوی زندگی اور مادی انعامات پر اللہ کی شکرگزاری سکھانے کے لیے آتے تھے۔

مگر انسان نے تہذیب کی تاریخ کو الٹی سمت سے دیکھنے کی غلطی کی۔ بجائے اس کے کہ تہذیب کو مثبت، تعمیری اور افادی رخ دینے والوں کے حوالہ سے عمرانی ارتقاء کا مطالعہ ہوتا، تہذیب کو کفر و شرک، مادی برتری، معصیت اور فساد کے پہلو سے دیکھا گیا یہاں تک کہ تہذیب بجائے خود ایک مذموم صورت حال بن کر رہ گئی۔

تہذیبی کشمکش کا آغاز: حضرت ادریسؑ کے زمانہ میں دنیا کی تہذیب مثبت اور منفی دونوں رخوں پر ایک ساتھ پیش رفت کررہی تھی۔ حضرت ادریسؑ اور ان کے ساتھ اہل ایمان کی جماعت، زمین پر انسانوں کی بقا اور انسانی تہذیب کے مثبت تسلسل کے لیے مختلف عمرانی محاذوں پر تگ و دو کررہے تھے۔ دوسری طرف منفی رخ کی سرداری بنی قابیل کا دولت مند اور برسر اقتدار گروہ اور بنی شیث کا گمراہ طبقہ کررہا تھا۔

اس وقت سے آج تک مثبت و منفی تہذیب کی کشمکش دین اور کفر اور حق و باطل کی آویزش کے عنوان سے جاری ہے۔ انفرادی سطح پر اس آویزش کا آغاز قابیل کے جرم اور اس پر حضرت آدمؑ کی سرزنش سے ہوا تھا، اور اجتماعی سطح پر قوم قابیل اور امکانی طور پر آل شیث کے گمراہ طبقات کے خلاف حضرت ادریسؑ کی رسالت سے ہوا۔

مولانا محمد مالک کاندھلوی (معارف القرآن/ادریسی ۸: ۲۵۴) نے علامہ ابوالشکور سُلمیؒ کی کتاب التمہید سے روایت کی ہے کہ شرک اور کفر کی ابتداء حضرت اخنوخؑ جن کو ادریس بھی کہا جاتا ہے، کے زمانہ میں ہوئی۔ اس سے قبل کل دنیا دین واحد اور توحید پر قائم تھی۔ جزوی

طور پر معصیت اور نافرمانی کا ارتکاب تو آدمؑ کے بیٹے قابیل ہی نے ہابیل کو قتل کر کے کیا تھا، لیکن یہ نوعیت کفر اور شرک کی نہ تھی بلکہ ارتکاب معصیت و نافرمانی کی تھی۔ شرک کا آغاز حضرت ادریسؑ یا اخنوخ کے بعد سے حضرت نوحؑ تک کے زمانہ میں ہوا۔

ابن جریر طبری (۸۳۸۔ ۹۲۳ء) (تاریخ الامم والملوک ۱:۱۱۹) نے حضرت ادریسؑ کے زمانہ میں دنیا کو انتہائی ترقی یافتہ قرار دیا ہے۔ ان کی روایت ہے کہ اسی دور میں بیوراسپ (بےوَراَسپ، وہ جس کے اصطبل میں دس ہزار گھوڑے/اسپ تھے) نامی ایک زبردست بادشاہ حکمراں تھا جس تک اسلام کی دعوت پہنچی تھی۔ اسی کو اژدہاک (عربی میں ضحاک) بھی کہا جاتا ہے اور وہ ایران سے عراق تک کا بادشاہ تھا۔ اسے جادو کا موجد کہا جاتا ہے، جس سے باور آتا ہے کہ اس کے زمانہ میں کچھ محیر العقول طبیعیاتی ایجادات ہو چکی تھیں یا ہو رہی تھیں جنہیں کم فہم لوگ جادو سمجھتے تھے۔ طبری نے ان میں سے دو ایجادوں کا ذکر کیا ہے: ایک یہ کہ بیوراسپ کے پاس سونے کا بانس نما ایک ڈنڈا تھا جس پر پھونک مار کر بادشاہ جو چاہتا وہ اسے حاصل ہو جاتا تھا۔ مورخ ابن اثیر (۱۱۶۰۔ ۱۲۳۳ء) اس باب میں خاموش ہیں۔ دوسری ایجاد کا تعلق طہمورث ابن ہوشنگ نامی بادشاہ کے زمانہ سے تھا جو شہر بابل کا پہلا حکمراں تھا، بلکہ ایک روایت ہے کہ شہر بابل اسی نے بنایا اور بسایا تھا۔ طبری کی روایت ہے کہ وہ بھی دیندار بادشاہ تھا اور اپنی رعایا کے حق میں نہایت مشفق و مہربان تھا۔ وہ بڑی شان و شوکت رکھتا تھا یہاں تک کہ شیاطین اس کے تابع تھے اور ایک دن اس نے ایک شیطان کی پشت پر سوار ہو کر دنیا کے طول و عرض کی سیر کی تھی۔ طبری نے یہ روایات فارسی قصص سے اخذ کی ہیں۔

یہ قصے اساطیر پہلوی بھی شمار کیے جاتے ہیں، ساتھ ہی زرتشت کے دین پہلوی کے صحیفے اَوِستا، تاریخ ایران اور فردوسی کے شاہنامہ میں ان کا تذکرہ آتا ہے۔ چونکہ یہ بے حد قدیم عہد کی باتیں ہیں اس لیے انہیں قبول یا رد کرنے کے دلائل یکساں قوت کے ہوں گے۔ ان قصوں کو بالکل رد کر دینے سے بھی نفس معاملہ میں کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ بیوراسپ اور طہمورث کی عجوبہ کلوں سے عہد ادریسؑ کی مادی ترقی کو ایک اضافی شہادت ملتی ہے اور اگر یہ سب حقیقت سے بعید ہے تو ایک دلیل کم ہو جاتی ہے مگر خود حضرت ادریسؑ کی اپنی ایجادات ان کے زمانہ میں

علم عناصر کے رواج وارتقاء کی کافی دلیل ہیں۔ بہر حال اوستا، تاریخ ایران اور شاہنامۂ فردوسی میں ان کے ذکر کا تقاضا ہے کہ ان امور پر ایک طائرانہ تجزیاتی نظر ڈال لی جائے۔

بیوراسپ اور طہمورث کے کرشمے: بیوراسپ کے طلائی عصا کے بارے میں دو باتیں کہی جاسکتی ہیں۔ اگر وہ بادشاہ خود کوئی نبی تھا تو اس کا عصا صدیوں بعد کے حضرت موسیٰؑ کے چوبی عصا کی مانند تھا۔ حضرت موسیٰؑ کا عصا ایک معجزہ تھا جس سے وہ مختلف النوع معجزاتی کام لیتے تھے۔ بیوراسپ بھی اپنے عصا سے ایسے کام لیتا تھا جو عام آدمی کے بس اور سمجھ سے باہر تھے۔ دوسری صورت میں بیوراسپ کا عصا بجائے خود معجزہ نہیں تھا بلکہ اس عہد کی کوئی مادی ایجاد یا سائنسی اختراع تھا۔ ایسی حالت میں وہ عصا کوئی ٹکنالوجیائی آلہ تھا جس کی کارکردگی کو آج کے سیل فون، ریموٹ کنٹرول، جی پی ایس، وغیرہ کی مدد سے سمجھا جاسکتا ہے۔ دونوں صورتوں کو بیک وقت یکساں منطقی قوت سے تسلیم بھی کیا جاسکتا ہے اور رد بھی کیا جاسکتا ہے اور دونوں کے نتائج کسی باشعور انسان کی دماغی رسائی سے باہر نہیں ہوں گے۔

اس موقعہ پر ابورغال ثمودی کا طلائی عصا یاد آتا ہے۔ سورہ الاعراف کی تفسیر میں امام ابن کثیر (ع: تفسیر ۳: ۴۴۲-۴۴۳) نے علمائے تفسیر کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ ثمود پر عذاب نازل ہوا تو ان میں سے کوئی ایک شخص بھی باقی نہیں بچا تھا، سوائے ابورِغال کے جو عذاب کے وقت حرم مکہ میں تھا، مگر جب وہ حرم سے باہر آیا تو آسمان سے ایک پتھر گرا جس کی ضرب سے وہ بھی مرگیا۔ اس سلسلہ میں امام ابن کثیر حضرت عبداللہؓ بن عمرو بن العاصؓ اور حضرت جابر بن عبداللہؓ کی ایک روایت لکھتے ہیں کہ غزوہ طائف کے موقعہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک قبر کے پاس سے گزرے اور اصحاب سے پوچھا جانتے ہو یہ کس کی قبر ہے؟ صحابہ نے کہا اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا یہ ثمود کے ایک شخص ابورِغال کی قبر ہے اور اس کے ساتھ اس کا سونے کا عصا (غُصن) بھی دفن کیا گیا تھا، چاہو تو قبر کھود کر دیکھ لو۔ لوگوں نے اپنی تلواروں سے اسے کھودا تو اس میں وہ طلائی عصا نظر آیا جسے انھوں نے نکال لیا۔ اس حدیث پر ابن کثیر نے کلام کیا ہے۔ اس میں عصا کی مزید کوئی تفصیل نہیں بیان کی گئی۔ اب یا تو وہ طلائی عصا ابورغال کی دولت مندی کا مظاہرہ تھا یا پھر بیوراسپ کے عصا کی طرح اس کا بھی کچھ مادی سائنسی مصرف تھا۔ ابورغال قوم ادریس سے بہت مدت بعد کا شخص تھا۔

طہمورث کے ذکر میں ابن اثیر (الکامل فی التاریخ ۱:۵۱) نے لکھا ہے کہ بادشاہ اچھل کر خود ابلیس کی کمر پر سوار ہوگیا تھا اور دنیا کی سیر کی اور اس کے بعد شیاطین کو ڈانٹ ڈپٹ کر منتشر کر دیا۔ اس کے علاوہ حضرت ادریسؑ کے باب میں ابن اثیر (الکامل فی التاریخ ۱:۵۰) نے ان کی ایجادات اور اولیات کا اجمالی ذکر کیا ہے کہ مثلاً بنی آدم میں وہ پہلے نبی تھے، انہوں نے سب سے پہلے قلم سے لکھا، علوم نجوم اور حساب میں نظر کی، جہاد بھی سب سے پہلے انہوں نے ہی کیا، کپڑے کاٹنے اور سینے کا فن ایجاد کیا، بنی قابیل کے مجرموں کو سب سے پہلے قید کرنے والے اور طوق غلامی پہنانے والے بھی وہی تھے۔ ابن جریر طبری نے اگرچہ حضرت ادریسؑ کی علمی شان اور اختراعی استعداد کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں لکھا تاہم طہمورث کے باب میں ابلیس کی بجائے شیاطین کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس معاملہ میں ابن اثیر کا قول تو آگے گفتگو کا دروازہ بند کر دیتا ہے کیونکہ ابلیس تو ایک ہی شیطان کا لقب ہے۔ البتہ امام طبری کی روایت میں اسم عام شیاطین کا لفظ توجہ طلب ہے۔

شیطان کی لسانی تاریخ: لغات میں لفظ شیطان کے عام معنی شریر، سرکش، مفسد، نافرمان، خبیث دیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ حق سے منحرف اور حق سے دور ہو جانے والا بھی بیان کیے گئے ہیں۔ مختلف صیغوں میں یہ لفظ قرآن حکیم میں بھی کفار کے سلسلہ میں وارد ہوا ہے۔ مصر میں مطبوعہ معجم الفاظ القرآن الکریم (۱:۶۳۰) میں العتاہ بھی اس کا مطلب دیا ہے جس سے وحشی، غصہ ور، ڈھیٹ، گستاخ، گردن کش، مغرور، بے ادب وغیرہ مراد ہوتا ہے۔ مولانا وحیدالزماں قاسمی کیرانوی (قاموس الوحید ۸۶۵) نے بتایا کہ شیطان وہ ہے جو اپنے ساتھیوں کا ہم قصد نہ رہے۔ اور حق سے منحرف بھی کہا ہے۔ مولانا عبدالحفیظ بلیاوی (المنجد اردو ۴۳۲) نے بھی حق سے دور ہو جانے والا بیان کیا ہے۔ ظاہر ہے طبری کی روایت میں لفظ شیاطین کو اصطلاحی معنی میں استعمال نہیں کیا گیا بلکہ اس کے مرادی معنی کچھ اور ہیں۔ مولانا مفتی محمود (تفسیر محمود ۱:۱۱۳) نے امام راغب اصفہانی (مفردات القرآن ۱:۵۶۸) سے استفادہ کرتے ہوئے اس لفظ کے دو لغوی معنی بیان کیے ہیں۔ اول یہ کہ یہ شطن سے مشتق جس میں حرف ن اصلی یعنی مصدر کا حصہ ہے جس کا مطلب دور ہونا ہے چونکہ شیطان اللہ سے دور ہو گیا اس لیے اسے شیطان کہا گیا۔ دوسری صورت میں یہ لفظ شاط یشیط سے مشتق ہے یعنی غصہ سے جل گیا یا ہلاک ہو گیا تو شیطان بروزن فعلان اور حیوان

چونکہ آگ سے پیدا کیا گیا اور ہلاک ہوگیا اور جہنم میں جلایا جائے گا اس لیے شیطان نام ہوگیا شریر اور فساد کرنے والے کا: یعنی اسم لکل عارم: عارم کہتے ہیں شریر اور مفسد کو۔ اسی ذیل میں مفتی محمود نے دوسری بات یہ بیان کی کہ لفظ شیطان سے ذہن عموماً جنات کی طرف جاتا ہے لیکن شیطان ہونا صرف جنات کا خاصہ نہیں ہے بلکہ ہر سرکش جن اور انسان اس میں شامل ہے۔ امام راغب بھی ابن خالویہ کے حوالہ سے یہی بیان کرتے ہیں۔ البتہ شیاطین الجن زیادہ قوی ہیں بہ نسبت شیاطین اِنس کے۔ اور ابلیس تو شیاطین کا صرف ایک فرد ہے، ورنہ اس کی اقسام بہت زیادہ ہیں۔ امام راغب نے یہ بھی کہا ہے کہ انسان کی ہر بری خصلت کو شیطان کہا جاتا ہے۔

اس سے پہلے کہ لفظ شیاطین کے مرادی معنی پر مزید بات کی جائے، سورہ النمل (۲۷:۳۹) کی اصطلاح عفریت پر بھی ایک متوازی نظر ڈال لینا مناسب ہے۔ آیت میں اسے واضح طور پر ایک جن کہا گیا ہے۔ امام راغب (مفردات القرآن ۲:۷ ۱۴) نے اس کا ایک معنی قوی ہیکل دیا ہے اور کہا ہے کہ جنوں میں سے عفریت اس جن کو کہا جاتا ہے جو نہایت موذی اور شریر ہو، نیز استعارتاً شریر انسان کو بھی عفریت کہہ دیتے ہیں۔ عبداللہ یوسف علی نے لفظ عفریت کا انگریزی ترجمہ قوی اور طاقت ور (a powerful one) کیا ہے۔ مولانا اشرف علی تھانوی (بیان القرآن ۷۹۲) نے قوی ہیکل لکھا ہے۔ امام طبری (جامع البیان ۱۹: ۴۶۴) نے جنوں کا سردار مارِد قوی (یعنی مستعد و متحرک، بھاری بھرکم، قوی ہیکل) لکھا ہے۔ امام بغوی (معالم التنزیل ۶: ۱۶۴) نے مارد قوی کے علاوہ ہوشیار عفریت اور اہل لغت کے حوالہ سے قوی الشدید بھی لکھا ہے۔ اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ اگرچہ عفریت کے لفظی معنی خبیث، موذی اور شریر وغیرہ ہیں، لیکن کسی خاص حالت میں اس سے مثبت معنی بھی مراد لیے جاتے ہیں۔ اسی طرح لفظ شیاطین ابلیس اور اس کی ذریت کے لیے اصطلاحی معنی میں استعمال ہوتا ہے جبکہ کسی دوسری کیفیت میں اس کا مفہوم مختلف بھی ہوسکتا ہے۔

اس لسانی پس منظر میں المسعودی (مروج الذہب ۱: ۳۴) کا بیان دلچسپی کا باعث ہے کہ سرزمین فارس کا اولین بادشاہ کیومرث دراصل امیم بن لاوذ بن ارم بن سام کی اولاد میں تھا اور امیم پہلا شخص تھا جس نے فارس میں معاشرہ منظم کیا، مکانات تعمیر کیے، صحن بنائے اور کمروں پر

چھتیں ڈالیں (المسعودی۔مروج الذہب ۲: ۱۱۱)، جبکہ اس سے پہلے اس خطہ میں لوگ خانہ بدوش تھے اور خیموں میں غیر متمدن زندگی گزارتے تھے۔اس سے المسعودی (مروج الذہب ۱: ۳۴) کا یہ بیان سمجھ میں آتا ہے کہ جب کیومرث کا باپ امیم ارض فارس میں اترا تو وہاں اخبار عرب کے مطابق ان دنوں ''جنات'' کا غلبہ تھا (غلبت علیھا الجن)۔ابن سعد (طبقات الکبریٰ ۱: ۵۴) نے لکھا ہے کہ قوم امیم سرزمین اُبار (م ط غ: مسکن عاد) میں جا بسی اور وہیں منقرض بھی ہوئی (پھیلی)۔یہ مقام علاقہ یمامہ وشحر کے درمیان واقع ہے مگر اب اس (ابن سعد کے) زمانہ میں وہاں تک کسی کو رسائی نہیں کیونکہ اس پر جن غالب آچکے ہیں۔اس علاقہ کا نام اُبار بن امیم کے نام پر اُبار پڑا تھا۔

ان بیانات سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ شیاطین انسانوں اور غیر انسانی مخلوق یعنی جنوں دونوں میں پائے جاتے ہیں اور کبھی کبھی غیر متمدن اور غیر مہذب مگر قوی ہیکل، غصہ ور اور جفاکش انسانوں پر بھی شیاطین کا لفظ بولا جاتا تھا۔

شیاطین سے ستارہ پرستی تک: غیر انسانی شیاطین کو فارس کی قدیم زبان میں دیو کہا جاتا تھا۔جدید فارسی میں بھی یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔دیگر کئی قدیم قوموں میں بھی شیاطین کا تصور پایا جاتا ہے اور ان کی اساطیری داستانوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شیاطین انسانوں میں بھی ہوتے تھے اور ایک غیر انسانی مخلوق میں بھی پائے جاتے تھے۔المسعودی کے متذکرہ بالا بیان سے ذہن قدیم آریائی اساطیر کی طرف بھی جاتا ہے۔ایران سے خارج البلد ہوکر مشرق میں سواد ہند میں آنے والے آریہ قبائل میں لفظ دیو خداؤں کے معنی میں استعمال ہونے لگا، جیسا کہ سنسکرت اور جرمانی زبانوں کے توسط سے دیگر جدید یورپی زبانوں میں تھیو (theo) اور اس کے مشتقات مثلاً تھیوفانی (خدائی ظہور-theophany) اور تھیولوجی (دیوتا وِدّیا-theology) وغیرہ آج بھی مستعمل ہیں۔شیاطین وغیرہ کے لیے عہد پارینہ کے ہندستانی آریوں میں اَسُور اور راکشس کے الفاظ رائج ہوئے۔قدیم آریہ زبان میں غیر آریہ اور غیر مہذب لوگوں کو راکشس کہا جاتا تھا۔روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ غیر معمولی قوت رکھنے کے باوجود راکشس انسان ہی ہوتے تھے اور غیر انسانی شیاطین کو اَسُور کہا جاتا تھا۔ہندستانی آریوں کی اسطوری داستان مہابھارت میں آتا

ہے کہ پانچ پانڈوؤں میں کے دوسرے بھائی دیو قامت بھیم سین نے ہڑمبا یا ہڑمبی نام کی ایک راکشسنی سے بیاہ رچایا تھا اور اس سے گھٹوتکچ نامی ایک لڑکا بھی پیدا ہوا تھا جو مہابھارت کی جنگ میں مارا گیا تھا۔ اس قصہ سے معلوم ہوتا ہے کہ راکشس انسان ہی تھے اور غیر آریہ نسل سے جنوبی ہند کے باشندے ہوتے تھے۔

اس بحث سے نہ تو جنات کے وجود کا انکار لازم آتا ہے جو ابلیس کی نوع اصلی ہے جیسا کہ قرآن حکیم سے ثابت ہے، اور نہ انسانی شیاطین کا انکار ہوتا ہے جو ابلیسی قوتوں کے تابع ہوکر انسانوں کو راہ راست سے بھٹکاتے ہیں۔ بلکہ یہاں مراد ایک ایسے انسانی گروہ کی شناخت ہے جو انتہائی غیر مہذب اور جنگلی بھی ہوسکتی ہے کہ خود انسانوں سے مانوس نہ ہو اور ایک بے حد ترقی یافتہ اور ذہین و تعلیم یافتہ گروہ بھی ہوسکتا ہے جو اپنی ایجادی و اختراعی صلاحیتوں سے معاشرہ کو تباہی کے راستہ پر ڈال دیتا ہے۔

المسعودی (مروج الذہب ۲: ۱۸۴) کا بیان ہے کہ فارس کے بادشاہ جمشید کے زمانہ میں بوذاسپ (بُدھا) نامی ایک راہب ارض ہند (غالباً گنگا جمنا کے دوآبہ) سے سندھ آیا اور وہاں سے سجستان، زابلستان اور کرمان ہوتا ہوا بلاد فارس میں آیا۔ اس نے خدائی پیمبر ہونے اور اللہ اور بندوں کے مابین رابطہ ہونے کا دعویٰ کیا اور لوگوں میں ستارہ پرستی، اصنام پرستی اور آتش پرستی رائج کی۔ اس نے کہا کہ آگ ستاروں کی روشنی کی مظہر ہے اس لیے مقدس اور لائق عبادت ہے۔ اسی کو صابی مذہب کہا جاتا ہے۔ بوذاسپ کا کہنا تھا کہ اس آسمان سے ستاروں اور کواکب کی نگہداشت کامل ہے، صلاح غالب ہے، یہی معدن حیات ہیں، یہ ستارے تمام حالات و واقعات کے مدبر ہیں اور اپنی گردشوں، طلوع و غروب اور خطوط ربط کے ذریعہ دنیا کے نظام پر اثر ڈالتے ہیں۔ ''چنانچہ کمزور عقل والوں کی ایک جماعت نے اس کا اتباع کیا''۔ ان میں جمشید بھی تھا۔

بوذاسپ کا نیا مذہب دوتین باتوں کی طرف توجہ مبذول کرواتا ہے۔ اول یہ کہ بوذاسپ اور صابیوں کو علم فلکیات میں خاصی دست گاہ حاصل تھی اور انسانوں اور زمین پر ستاروں کی چال اور گردش کے اثرات جیسے عقائد سے قطع نظر وہ منازل سیارگان کا علم رکھتے تھے اور ان کی گردشوں کا مشاہدہ کرتے تھے۔ یہ نیا مذہب علم الافلاک میں حضرت ادریسؑ کی معجزاتی ابتکاری سائنسی تشریحات

اوراضافوں کی ایک بڑی دلیل بنتا ہے جن کی تفصیلات آگے بیان میں آئیں گی۔

طہمورث کا طیارہ یا ہوا باز: طہمورث کا قصہ اس قدیم زمانہ کی مادی تہذیبی حالت کی کچھ وضاحت کرتا محسوس ہوتا ہے۔اس روایت سے اتنا ثابت ہوتا ہے کہ امکانی طور پر حضرت ادریسؑ کے متصورہ ہم عصر شاہ طہمورث نے بظاہر سائنسدانوں کو اپنے تابع کر رکھا تھا۔ یہ ہمیشہ کا تہذیبی بلکہ سیاسی اصول ہے کہ سائنس دانوں کو اہل سیاست اپنے تابع فرمان اور ماتحت رکھتے ہیں۔ وہ معاشرہ میں خدمت گار کا کردار ادا کرتے ہیں، اس پر حاکم اور موثر نہیں ہوتے۔انہیں کسی بھی سیاسی معاشرہ میں آزادانہ کام کرنے کا اختیار نہیں ہوتا کیونکہ اپنی آزادہ روی اور سرکش طبیعت کی وجہ سے عموماً وہ معاشروں کو جرائم و معاصی اور تباہی کی سمت لے جاتے ہیں۔طہمورث کے بیان میں امام طبری (تاریخ الامم والملوک ۱:۱۴۱) کی روایت ہے کہ ’’ایک دن اچانک وہ (طہمورث) چھلانگ لگا کر شیطان پر سوار ہو گیا اور اس پر سوار ہو کر زمین کے طول و عرض کا چکر لگایا، پھر اس نے شیطان اور اس کے حواریوں کو خوب ڈانٹا، یہاں تک کہ وہ ایک دوسرے سے جدا ہو کر روئے زمین پر منتشر ہو گئے‘‘۔

اس تشریح کے بعد یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ شاہ طہمورث ابن ہوشنگ کے وقت میں اس لفظ سے وہ لوگ مراد ہو سکتے تھے جو عام لوگوں سے مختلف ہوں، بڑی قوت رکھتے ہوں، اپنے کام میں ہوشیار اور مستعد ہوں۔ان کو شیاطین قرار دینے کا سبب یہ ہوا کہ وہ ہمہ وقت کمر ہی پر کمر بستہ رہتے تھے اور ان سے مثبت کام لینے کے لیے ان پر قابو رکھنا اور ان کی ’’پشت پر سوار رہنا‘‘ ضروری تھا۔چونکہ تفسیر میں ان شیاطین کی نوع نہیں بتائی اس لیے وہ جنات بھی ہو سکتے ہیں اور انسان بھی۔انہیں انسان مانا جائے تو شیطان کے عام اصطلاحی معنی ان پر منطبق نہیں ہوں گے، یعنی ان کی کمر پر سوار ہو کر ساری دنیا کی سیر اس طرح ممکن نہیں جیسے تاریخ طبری میں بیان ہوا ہے۔بات اگر محض قصہ کہانی ہو تو کہہ سکتے ہیں کہ وہ شیاطین بھی الہ دین کے چراغ کے جن کی طرح تھے جس کی پشت پر سوار ہو کر الہ دین سفر کرتا تھا۔لیکن حضرت سلیمانؑ کے واقعہ میں ان پر ہوا کا مسخر ہونا اور ان کے قصہ کا عفریت اور طبری کی روایت میں طہمورث کے شیاطین سے کچھ ایسے معنی ظاہر ہوتے ہیں جو اُن لوگوں کی غیر معمولی مادی، علمی یا عملی صلاحیتوں کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔

کیا وہ شیاطین جہاز راں سائنس داں، مہندس ہو سکتے ہیں؟ جی ہاں۔ اس کا امکان ہے۔

اسطورہ اور حقیقت کی بحث: اس بات کو دو طرح سے دیکھا جا سکتا ہے۔ اگر وہ شیاطین جنات تھے تو طہمورث کا تصرف و اقتدار آج کے کسی بھی بڑے سے بڑے بادشاہ اور سیاسی قائد سے زیادہ وسیع و بسیط تھا۔ موجودہ تہذیب میں کوئی طاقتور ترین لیڈر بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس نے نوع جنات کو اس طرح تابع کر رکھا ہے جیسا طہمورث نے کیا تھا کہ ان پر سواری کرے اور ساری دنیا کے طول و عرض کی سیر کر کے پھر ان شیاطین کو ڈانٹ بھی پلائے اور ان کی جتھا بندی کو توڑ دے۔ اور دوسری صورت میں وہ ''شیاطین'' اگر جہاز راں سائنس داں اور مہندسین تھے تو لامحالہ یہ دلیل ہے اس عہد ادریسی کی غیر معمولی سائنسی ترقی کی جس کی ایک مثال عہد رواں کی مغربی تہذیب میں طیارہ سازی، ہوائی جہاز رانی اور خلابازی کی صنعتیں پیش کرتی ہیں۔

پہلی بات اس بیان کو اساطیری قصہ کہانی میں بدل دیتی ہے جس سے قدیم زمانوں کے انسان کی علمی، ذہنی، فکری، اختراعی صلاحیت کا کوئی ثبوت مہیا نہیں ہوتا اور خود آج اختراعی میدانوں میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کے تہذیبی تواتر یا تسلسل کی کوئی تاریخی دلیل نہیں بنتی سوائے اس کے کہ یہ سب کچھ ایک وقتی اتفاق اور اصلاً غیر انسانی فعل ہے کیونکہ اس نظریہ کے ماتحت بندروں اور شیروں کی طرح انسان میں بھی فطری طور پر یہ سب کچھ کر گزرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ ایسے میں لازم آئے گا جو کچھ بظاہر انسان کر رہا ہے وہ سب اسی قسم کے شیاطین کی کارستانی ہے جن کو طہمورث نے ڈانٹ ڈپٹ کر منتشر کر دیا تھا۔ یہ اسی قسم کا خیال ہے جیسے موجودہ دور میں بہت دانش مند سائنس داں اور تاریخ نویس بھی یہ گمان رکھتے ہیں کہ ہزاروں سال پہلے کے مہیب سنگی آثار قدیمہ اور محیر العقول عمارتوں وغیرہ کو کوئی خلائی مخلوق بنا کر دنیا سے غائب ہو گئی۔ اس گمان کو غیر معقول کہہ کر رد کر دیا جائے، جیسا کہ کیا جاتا ہے تو خود طہمورث کے دور میں انسان کو بہت ترقی یافتہ ماننا لازم آئے گا۔ چنانچہ انسانوں کے ساتھ غیر انسانی مخلوق پر حکمرانی کے سبب سے طہمورث موجودہ زمانہ کے امریکی صدر سے زیادہ طاقتور اور موثر ثابت ہوتا ہے۔ اسی طرح ان شیاطین کو جنات تسلیم کرنا عقلاً بھی محال ہے کیونکہ آدم کو جو علمی اور اختراعی صلاحیت دی گئی تھی اس سے جنات کی نوع کو محروم رکھا گیا تھا جو قصۂ تخلیق آدم میں ابلیس کے غم و غصہ اور انتقامی

جذبہ کا سبب بنا۔ ویسے بھی دنیا کی تاریخ میں جو اختراعی اور ایجادی کارنامے انسان نے کیے ہیں ویسی کوئی روایت جنات کے بارے میں نہیں ملتی۔ لہٰذا ابن کثیر کی روایت میں شیاطین کا حوالہ جنات پر منطبق نہیں ہوتا۔ وہ انسان ہی ثابت یا ظاہر ہوتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

بعثت ادریسؑ کا سبب: اس دوسری بات کو درست مان لیا جائے تو ثابت ہوگا کہ حضرت ادریسؑ کے زمانہ میں انسان عنصری اور طبیعیاتی علوم میں غیر معمولی ترقی کر چکا تھا اور ستارہ پرستی کے آغاز کے ساتھ معاشرہ میں شرک پھیل چکا تھا۔ چونکہ مادی ترقی اور شریعت سے روگردانی کی وجہ سے شیطانی صفات اختیار کر کے انسان گمراہ ہوگیا تھا اس لیے حضرت ادریسؑ جیسے موجد سائنس داں نبی کا ظاہر ہونا لازمی ہوگیا تھا تا کہ انسانوں کو اصل فطرت کی طرف لوٹایا جائے۔ پاپائرس کاربیوراسپ کے طلائی عصا اور طہمورث کے ہوائی سفر کو تسلیم کر کے فقط یہ بات معلوم ہوتی ہے اس زمانہ میں بھی انسان ٹکنالوجی کے اعلیٰ مقام پر پہنچ چکا تھا اور اس سے خود قوم ادریسؑ کے مادی ارتقاء کے حق میں ایک اضافی دلیل مہیا ہوتی ہے۔ اور ان دلیلوں یا ظن وتخمین کو رد کر دیا جائے تو بھی قوم ادریسؑ کی ارتقائی کیفیت پر حرف نہیں آتا کیونکہ اس کا ثبوت تو خود حضرت ادریسؑ کی مادی ایجادات میں موجود ہے۔ اس صورت میں ان ایجادات کی حیثیت معجزاتی قرار پاتی ہے، سائنسی اور اختراعی نہیں۔ مگر پھر اس طرح حضرت آدمؑ کو جو علم الاسماء عطا کیا گیا تھا جس کی بناء پر وہ مسجود ملائک ٹھہرے تھے اس کا افادی پہلو متاثر ہوجاتا ہے اور بس یہ ثابت ہوتا ہے وہ علم بھلے انسانوں کی میراث نہ تھا یا اس پر شیاطین اور مفسد ابنائے آدم نے قبضہ کرلیا تھا۔ یہ بات تسلیم نہیں کی جاسکتی۔ حضرت آدم کو علم الاسماء شیطان صفت ذریت کی خاطر نہیں دیا گیا تھا، بلکہ اصلاً رحمانی صفت انسانوں کی میراث بنایا گیا تھا، ورنہ ابلیس کو انہیں سجدہ کرنے پر اعتراض نہ ہوتا۔

اس موضوع پر حضرت سلیمانؑ کے لیے ہوا کو مسخر کیے جانے (الانبیاء ۸۱:۲۱) اور مہینہ بھر کا راستہ آدھے دن میں طے کرنے کا ذکر کرتے ہوئے شیخ عبدالحق حقانی دہلوی (تفسیر حقانی ۲۲۲:۵) نے واضح کیا ہے کہ مفسرین اسلام اور مورخین یہود کے ہاں یہ روایات مشہور ہیں کہ حضرت سلیمانؑ کسی ہوائی تخت پر مع اپنے مصاحبوں کے سفر کرتے تھے۔ اس کے بعد لکھتے ہیں ''اور اگر ایسا ہو بھی تو عقلاً کچھ ممنوع نہیں کیونکہ اول تو حضرت سلیمانؑ نبی تھے اور ان کے معجزہ سے

ایسا ہونا ممکن ہے۔ دوم ہر زمانہ میں ایسے ایسے عجائب وغرائب صنائع اختراع ہوئے ہیں کہ جوان صنائع کے صفحۂ عالم سے محو ہوجانے کے بعد افسانہ ودوراز عقل معلوم ہوتا ہے۔ آج کل ہوائی جہاز کی رفتار کو دیکھیے پھر کیا ممکن نہیں کہ اس عہد میں اسی قسم کی سواری ایجاد ہوئی ہو"۔

اب اگر اس قسم کی ہوائی سواری کی ایجاد حضرت سلیمانؑ کے زمانہ میں ممکن تھی تو ان سے بہت پہلے حضرت ادریسؑ کے دور میں بھی مختلف قسم کی مادی اور طبیعیاتی ایجادات کا امکان اتنا ہی قوی ثابت ہوا۔ اسی بناء پر حضرت ادریسؑ کی مخاطب قوم کی تہذیبی کیفیت کا ایک معقول اندازہ خود انہی کی ایجادات سے لگایا جانا چاہیے۔

میراث آدم کا پہلا مظاہرہ:

حضرت آدمؑ کو علم اسماء عطا کیا گیا تھا۔ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَاءَ كُلَّهَا (البقرہ ۲:۳۱) اور علم سکھا دیا آدم کو سب چیزوں (کے خواص وآثار) کا۔ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی (قصص القرآن ۱: ۲۷-۲۸) اس سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ بالآخر فرشتوں کو احساس ہوگیا کہ "خلافت الٰہیہ کا مدار کثرت تسبیح وتہلیل اور تقدیس وتمجید پر نہیں بلکہ صفت علم پر ہے اس لیے کہ ارادہ واختیار، قدرت تصرف اور قدرتِ اختیار یا دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ حکومت ارضی صفت علم کے بغیر ناممکن ہے"۔ مزید لکھا (قصص القرآن ۱:۲۹) کہ فرشتوں کو سمجھ میں آگیا کہ "ہم نہ خورد ونوش کے محتاج ہیں کہ زمین میں ودیعت شدہ رزق اور خزانوں کی جستجو کرتے، نہ ہمیں غرق کا اندیشہ کہ کشتیوں اور جہازوں کی ایجاد کرتے، نہ مرض کا خوف کہ قسم قسم کے معالجات، اشیاء کے خواص، کیمیائی مرکبات، فوائد طبیعیات وفلکیات، طبی ایجادات، علوم نفسیات و وجدانیات اور اسی طرح کے بیش بہا اور بے شمار علوم وفنون کے اسرار اور ان کی حکمتوں سے واقف ہوسکتے۔ بلاشبہ یہ صرف حضرت انسان ہی کے لیے موزوں تھا کہ وہ زمین پر خدا کا خلیفہ بنے اور ان تمام حقائق ومعارف اور علوم وفنون سے واقف ہوکر نیابت الٰہی کا صحیح حق ادا کرے"۔

چنانچہ رہتی دنیا تک ابنائے آدم کے لیے یہ علم پدری میراث ہے۔ ان اسمائے عناصر کی اولین مکمل اختراعی اور ارتفاقی تہذیب کے بانی حضرت ادریس علیہ السلام تھے۔

دنیا کی پہلی ارتفاقی تہذیب کی بنا پہلے انسان حضرت آدمؑ نے ڈال دی تھی۔ اس تہذیب

کو اسی مثبت اور مفید عام رخ پر ان کے بیٹے حضرت شیثؑ اور پوتے حضرت اِنوشؑ پروان چڑھاتے رہے۔ المسعودی (مروج الذہب ۱:۳۱) کا بیان ہے کہ قینان بن انوش بن شیث بن آدمؑ نے شہر قائم کیے تھے اور قینان کے پوتے یعنی حضرت ادریسؑ کے والد لود (یرد) کے زمانہ میں نہ صرف بنی شیث کے خلاف بنی قابیل نے جنگیں شروع کردی تھیں بلکہ وہ قوم تفریحات اور گانے بجانے (ملاہی) اور قمار بازی کی شوقین بھی تھی۔ دوسری طرف تہذیب کی مثبت ترقی کو ایک نقطہ عروج تک حضرت انوشؑ کی چوتھی نسل میں بائبل کے اخنوخ (بائبل: Enoch؛ عبرانی: حنوخ رحنوک) یا قرآنی حضرت ادریسؑ نے پہنچایا۔ بائبل کے شجرہ کے مطابق اخنوخ یعنی حضرت ادریسؑ حضرت آدمؑ کی ساتویں نسل میں تھے: اخنوخ ابن یارِد (یا یرد، یا لود) ابن مہلا لیل بن قینان بن اِنوش (یا یانش) بن شیث بن آدمؑ۔ حضرت ادریسؑ کی والدہ کا نام برکتہ تھا، اور ایک روایت میں ان کا نام اشوت بتایا گیا ہے۔ ابن اثیر (الکامل فی التاریخ ۱:۵۱) نے کہا ہے کہ ان کی اہلیہ کا نام ہدانہ یا ادانہ یا اذانہ بنت باویل بن محول بن خنوخ بن قین (قابیل) بن آدمؑ تھا۔ ابن اثیر (الکامل فی التاریخ ۱:۵۱) نے بتایا کہ متوشلح بن اخنوخ (ادریس) کا نکاح عربا بنت عزازیل بن انوشیل بن خنوخ بن قین سے ہوا اور ان کے بطن سے لمک کی ولادت ہوئی جو حضرت نوحؑ کے والد تھے۔ حضرت نوحؑ کی والدہ کا نام قینوش بنت براکیل بن محویل بن خنوخ بن قین تھا۔

حضرت ادریسؑ کی سریانی اصل: اولاد آدم میں حضرت ادریسؑ پہلے رسول تھے، یعنی انہیں شریعت دی گئی تھی۔ امام ابن جریر طبری (تاریخ الامم والملوک ۱:۱۴۰) کا بیان ہے کہ انہیں اپنے زمانہ میں تمام روئے زمین کے لیے نبی بنا کر بھیجا گیا تھا۔ مفسرین قرآن حکیم نیز المسعودی (مروج الذہب ۱:۳۲) کا بیان ہے کہ ان پر ۳۰ صحیفے نازل ہوئے تھے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ سے مروی ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے انہیں سریانی نبی شمار کیا ہے (طبری، تاریخ الامم والملوک ۱: ۱۴۰)۔ اس حدیث کے مطابق حضرت ادریسؑ کے صحائف بھی سریانی زبان ہی میں نازل ہوئے تھے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ تمام سامی زبانیں سریانی ہی کی لسانی شاخیں ہیں۔

مفسرین قرآن حکیم اور توراۃ کے مطابق ان کا نام اخنوخ تھا۔ قرآن حکیم میں انہیں نام کے بجائے لقب ادریس سے یاد کیا گیا ہے۔ ان کے قرآنی لقب پر مفسرین میں بحث پائی جاتی ہے

کہ یہ بظاہر عربی مصدر درس سے مشتق لگتا ہے مگر قواعد زبان کی رو سے محل نظر ہے۔ تاہم کئی مفسرین کہتے ہیں کہ وہ کلام اللہ کی کثرت سے تلاوت کرتے تھے اور اس کا درس دیتے تھے اس لیے ادریس لقب قرار پایا۔ اس رائے کی تائید حبشی بائبل کی کتاب اخنوخ سے ہوتی ہے جس میں کئی مقامات پر وہ اپنے بڑے صاحب زادے حضرت متوشلح کو خطاب کرتے ہیں اور ایک مقام پر اپنے سارے بیٹوں اور دیگر مومنین کو جمع کر کے انہیں اپنے الہامات کا درس دیتے ہیں۔ مشرقی افریقہ میں حبشہ اور اریتریا کا توحیدی کلیسا اپنی بائبل میں ایک کتاب اخنوخ یا کتاب حنوک کا اضافہ کرتا ہے۔ لیکن یہودی اور تمام مسیحی دیگر فرقے، بشمول کیتھولک، پروٹسٹنٹ، مورمن وغیرہ، اس کتاب کی توثیق نہیں کرتے اور نہ ان کی بائبلوں میں یہ کتاب شامل ہے۔ امہریہ زبان کی حبشی بائبل میں اس صحیفہ کا نام ''مصحفہ اخنُوخ'' ہے۔ اس کے سات حصے اور ۱۰۸ ابواب ہیں جن کی طوالت مختلف ہے۔

مفسرین قرآن حکیم نے حضرت ادریسؑ کی کئی ایجادات کا تذکرہ کیا ہے۔ تاہم مصحفہ اخنُوخ میں صراحتاً ان کی کسی ایجاد کا ذکر نہیں ہے اگر چہ اس کے بالاستیعاب مطالعہ میں نہ صرف ایجادات کے حوالے ملتے ہیں بلکہ ایک عظیم تہذیب اور بڑے تمدن کی شہادت بھی پائی جاتی ہے جس کی تفصیلات حسب موقع بیان میں آئیں گی۔

حضرت ادریسؑ کی شخصیت: حضرت ادریسؑ کی شخصیت پر مفسرین میں کافی بحث پائی جاتی ہے جس کا کچھ اجمالی ذکر مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے قصص القرآن میں کیا ہے۔ بعض مفسرین انہیں اسرائیلی نبی مانتے ہیں اور ادریس والیاس کو ایک ہی شخص قرار دیتے ہیں اور اسی بحث کی بنیاد پر ان مفسرین نے اور ان کے اتباع میں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے حضرت ادریسؑ کا ذکر حضرت نوحؑ کے بعد کیا ہے مگر ان کا جو شجرۂ نسب دیا ہے اس میں انہیں حضرت نوحؑ سے پہلے ثابت کیا ہے۔ مفسرین کی ایک جماعت میں انہیں الیاسؑ ماننے کا ایک ہی سبب ہے کہ اسرائیلی روایات میں آتا ہے کہ حضرت الیاسؑ ایک پہاڑی پر گئے جہاں ایک شعلہ میں روپوش ہو گئے جو بگولے کی طرح انہیں آسمان میں لے گیا۔ اس سے ملتی جلتی ایک روایت حضرت ادریسؑ کے بارے میں بھی ہے۔ اسی سے بعض علماء کو دونوں میں یگانگت نظر آئی۔ لیکن حضرت ادریسؑ کے بارے میں جو بحث پیدا ہوئی وہ تمام تر صرف اس دلیل سے ختم ہو جاتی ہے کہ خود اسرائیلی روایات میں

حضرت الیاسؑ کی کسی ایجاد کا ذکر نہیں پایا جاتا، نیز حضرت الیاسؑ کا زمانہ تاریخ میں بہت بعد کا ہے اور اسرائیلی آثار کے مطابق ۸۸۰ قبل مسیح میں انہیں آسمان کی طرف اٹھالیا گیا تھا۔ ماہرین انساب کے مطابق حضرت ادریسؑ کا دور اس سے بہت پہلے کا تھا۔ دو مختلف انبیاء کا کسی ایک ہی معجزاتی کیفیت سے گزرنا محال نہیں ۔حضرت موسیٰؑ نے پتھر پر عصا سے ضرب لگائی تو بارہ چشمے پھوٹے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پیالہ میں دست مبارک ڈالا تو دریا بہہ نکلا۔ اسرائیلی روایات ہی کے مطابق حضرت الیاسؑ کا زمانہ قوم موسیٰؑ کے عبور دریا سے ۲۸۸۰ سال بعد کا ہے۔ اسرائیلی تقویم کے لحاظ سے ان کا ذکر حضرت سلیمانؑ کے بعد آنا چاہیے، حضرت نوحؑ کے بعد نہیں۔

قصہ مختصر حضرت ادریسؑ عالم انسانیت کے بالکل ابتدائی دور کے عبقری رسول ہیں کہ ان کا تاریخی زمانہ قطعی طور پر متعین کرنا تو ممکن نہیں، جبکہ حضرت الیاسؑ صرف اکیس صدی پہلے نبی ہوئے تھے۔ لہٰذا ان دو بزرگوں کو ایک قرار دینے کی یہ بحث غیر ضروری ہے۔ المسعودی، ابن کثیر، ابن اثیر، ابن خلدون جیسے تمام اہم مسلم مورخین حضرت ادریسؑ کو بالکل ابتدائی دور کی شخصیت شمار کرتے ہیں۔

تاریخی مآخذ کا محاکمہ: قرآن حکیم میں حضرت ادریسؑ کا ذکر بہت مجمل صرف دو آیات میں آیا ہے: سورہ مریم (۱۹:۵۶) اور سورہ الانبیاء (۲۱:۸۵) میں۔ دوسرا ذریعہ تفاسیر ہیں جن میں حضرت ادریسؑ کے علوم اور ان کی ایجادات کا خاص تفصیلی بیان آتا ہے۔ تیسرا ذریعہ ابتدائی عہد کے مسلم مورخین کی کتابیں ہیں جن میں تاریخ طبری (تاریخ الامم والملوک)، تاریخ المسعودی (مروج الذہب)، تاریخ ابن اثیر (الکامل فی التاریخ)، تاریخ ابن خلدون (کتاب العبر) وغیرہ داخل ہیں۔ چوتھا بڑا ذریعۂ معلومات مصحفہ اخنوخ ہے جسے بڑے مسیحی فرقے اور یہودی تو نہیں مانتے، مگر اس انکار کے باوجود عہد نامہ جدید کی کتاب مکتوب یہوداہ کے دو فقروں میں، ایک قول اخنوخ کا حوالہ بھی آتا ہے:

"اور اخنوخ نے بھی، جو آدم سے ساتواں تھا، ان کی پیش گوئی کی، یہ کہتے ہوئے کہ دیکھو، آقا آیا اپنے دس ہزار مقدسوں کے ساتھ (کنگ جیمس نسخہ (قدیم وجدید) کتاب یہوداہ ۱:۱۴)۔

البتہ نیو انٹرنیشنل نسخہ (New International Version - NIV) میں اسی درس کو یوں لکھا گیا

گیا ہے: اخنوک، آدم سے ساتویں، نے ان کے بارے میں پیش گوئی کی: ''دیکھو، آقا آرہا ہے ہزاروں اوپر ہزار اپنے مقدس افراد کے ساتھ''۔ کیتھولک بائبل میں اگرچہ یہ عبارت بہت مختلف الفاظ کے ساتھ ہے مگر اس میں بھی وہی دس ہزار مقدسین کا ذکر ہے۔ البتہ نظر ثانی شدہ معیاری کیتھولک نسخہ (Revised Standard Version Catholic Edition - RSVCE) میں دس ہزار مقدسین کے فقرہ کی جگہ ''اپنے مقدس ہجوم (myriad) کے ساتھ'' لکھا گیا ہے۔ تمام باہم متعارض نسخوں میں یہ عبارت رسول اللہ ؐ کی فتح مکہ کی بشارت ہے جس میں آپ ؐ دس ہزار صحابہ کے ساتھ تشریف لے گئے تھے۔ یہاں اس پیش گوئی پر بحث مقصود نہیں بلکہ صرف یہ دکھانا ہے کہ بائبل کے قدیم اور جدید نسخوں میں آج تک مستقل لفظی اور معنوی ترمیم ہوتی چلی آرہی ہے جس کی بناء پر اس سے تاریخی بیان میں تو کچھ مدد مل جاتی ہے مگر تاریخی استناد ممکن نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ہر عیسائی فرقہ کی بائبل مختلف ہے اور یہود و عیسائی باہم بھی ایک ہی عہد نامہ قدیم پر متفق نہیں ہیں اس لیے علمی اور تاریخی بیان میں مزید مشکل پیش آتی ہے۔ لہٰذا مسئلہ یہ ہے کہ مصحفہ اخنوخ کا حوالہ دیا جائے تو یہودی تو اس کے بالکل منکر ہیں؛ اور عیسائی اسے مانتے بھی ہیں اور اس کا انکار بھی کرتے ہیں۔ ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ انسائیکلو پیڈیا آف کرسچیانٹی/موسوعہ مسیحیت (Encyclopedia of Christianity ص ۴۱۱) میں یہ دعویٰ بھی کیا جاتا ہے کہ اس صحیفہ کے بعض اجزاء ۳۰۰ قبل مسیح میں اور بعض اجزاء ۱۰۰ ق م میں لکھے گئے ہیں۔ ظاہر ہے یہ حضرت ادریس ؑ کے زمانہ سے بہت بعد کی تاریخیں ہیں۔ اس سے گمان ہوتا ہے کہ اس زمانہ تک کم سے کم حبشہ اور اریتریا میں مصحفہ اخنوخ زبانی روایت کا حصہ تھا۔ یہ دعویٰ نہ بھی ہو تو یہ باور کرنا خود بہت مشکل ہے کہ کرہ ارض پر انسانی وجود کے پہلے ہزارے کی کوئی تحریر جوں کی توں آج تک باقی ہے۔ یا کسی قوم کی زبانی سینہ بہ سینہ روایت میں بلا حک و اضافہ باقی رہ گئی تھی۔ ایک خیال یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حضرت ادریس ؑ کی زبان کے معدوم ہوجانے کے بعد اسے امہریہ یا ارامی یا عبرانی کسی اور زبان میں دوبارہ تحریر کیا گیا ہو۔ مگر اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ پھر بھی مصحفہ اخنوخ سے بہت کچھ معلومات ضرور ملتی ہیں۔ اس کے بارے میں تمام تر شبہات اور اعتراضات کے باوجود اس مصحفہ کی تعلیمات اپنے مزاج اور پیرایہ بیان میں کسی نبی کی تعلیم سے ہم آہنگ ہیں۔ اس بنا

پر حضرت ادریسؑ کے بارے میں تاریخی اور تہذیبی بیان مرتب کرنے کے لیے قرآن حکیم کی تفاسیر اس اولین انسانی تہذیب کی تفصیلات کا پہلا مستند بنیادی ماخذ ہیں۔ ثانوی ذرائع مسلم مورخین کی کتابیں ہیں۔ اور تیسرے درجہ میں مصحفہ اخنوخ ہے۔

بنی قابیل کے معاشرتی حالات: گیارہ بزرگ مفسرین کے بیانات کے مطابق حضرت ادریسؑ نہ صرف ایک بڑے صاحب شریعت رسول تھے بلکہ دنیا کے پہلے عظیم موجد سائنس داں بھی تھے۔ ان کی بے شمار ایجادات نے انسان کو عمرانی زندگی کی بے شمار سہولتیں مہیا کیں۔ ان کے علاوہ ابن خلدون (مقدمہ ۱: ۲۲۲) نے بطور حدیث دیگراں لکھا ہے کہ ”تمام صنعتیں حضرت ادریسؑ کی طرف منسوب کی جاتی ہیں“، لیکن اپنی تاریخ میں انہوں نے حضرت ادریسؑ کا ذکر دو چار جملہ سے زیادہ نہیں کیا۔ تاہم ایسے شواہد موجود ہیں کہ حضرت ادریسؑ کے زمانہ میں اسمائے عناصر کا مادی اور طبیعیاتی علم بڑی حد تک ــــ انسانی تجربہ میں آچکا تھا اور انسان، بشمول بنی قابیل کئی ایجادات کر چکا تھا۔ مثلاً مصحفہ اخنوخ میں اینٹوں اور پتھروں اور لکڑیوں سے بنائی جانے والی عمارتوں، سونے چاندی پر مشتمل دولت کے انباروں، اناج سے لبالب بھرے ہوئے مخزنوں اور کھلیانوں، اعلیٰ قسم کے گندم کی کاشت اور عمدہ مشروبات کی تیاری، تجارت کے فروغ اور اس میں دھوکہ فریب، تلواروں، بحری جہازوں کے استعمال وغیرہ کا ذکر آتا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس عہد میں نقد اور صنعتی دھاتوں کی کانیں دریافت ہو چکی تھیں اور مرکب دھاتیں بنانے کی صنعت گاہیں کام کرنے لگی تھیں، اینٹیں بنانے، پتھروں کو تعمیر میں استعمال کے قابل بنانے والے اوزار و آلات بنا لیے گئے تھے، زراعت کا نظام، گندم کی اعلیٰ و ادنیٰ قسموں کی فصلیں، اناج کو تادیر ذخیرہ کرنے کے مخازن، انہیں کیڑوں سے محفوظ رکھنے کے طریقے، مشروبات کے لیے باغوں میں پھلوں کی پیداوار ہونے لگی تھی، مشروبات سازی کے آلات وغیرہ بنائے جارہے تھے۔ زربفت کے کپڑے بننے کا رواج بھی پڑ چکا تھا اور قوم کے رؤسا سونے چاندی کے تاروں سے بنے ہوئے کپڑوں کے لباس پہننے کے شوقین تھے۔

اسی کے ساتھ مصحفہ اخنوخ کے مطابق ظلم وتعدی، کفر و شرک، گمرہی اور معاصی کا بازار بھی گرم تھا، غریبوں سے بیگار لینے کا عام رواج تھا، مالدار کفار کو نوکر چاکر، حشم خدم، شان و شوکت کا بڑا زعم تھا، اپنی دولت کا غرور تھا اور اس غرور کے پیچھے اس قوم کی مادی ترقی تھی، اس کی ابتکاری قوت

اور ایجادی صلاحیت تھی جس کے بارے میں اس کا گمان تھا کہ اس کا مد مقابل کوئی نہیں۔ ایسی قوم کے لیے رسول کا بھی ایسا موجد اور جدید اصطلاح میں سائنس داں ہونا ضروری تھا جو اپنی ایجادات سے اس قوم کو عاجز کردے۔ کچھ مفسرین قرآن حکیم نے ان ایجادوں کو معجزات قرار دیا ہے۔ ادریسی ایجادات کو معجزات تسلیم کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے، لیکن اصل نکتہ اس دور کے اس عقلی معیار اور مادی علوم میں غیر معمولی دستگاہ ہے۔ مصحفہ اخنوخ میں ایسی روایات ملتی ہیں کہ حضرت ادریسؑ کو کچھ امور کی تعلیم فرشتوں سے حاصل ہوئی تھی۔ بے شک ہر نبی کا ابتکاری کام وحی ہوتا ہے یا معجزہ۔ تو کیا عجب کہ حضرت ادریسؑ کا معجزہ ان کی ایجادات ہوں اور یہ علوم انہیں بذریعہ وحی سکھائے گئے ہوں۔ مگر قابل توجہ نکتہ خود ایجادات ہیں جو دنیوی زندگی پر موثر ہوئیں اور اس دور کی معاشرت کا عنوان تھیں۔

کسی قوم کے تمدنی معیار کے مطالعہ میں انبیاء کے معجزوں کو مورخین نے اہمیت نہیں دی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ معجزوں کے مطالعہ اور عمرانی تجزیوں سے تاریخ کے فہم میں بہت مدد مل سکتی ہے۔ انبیاء کے معجزات پر غائر نظر کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر نبی کے معجزات اس کی قوم کے مبلغ علم، افتاد طبع اور معاشرتی وتہذیبی معیار کے مطابق ہوتے تھے کیونکہ اس کے بغیر وہ قوم عاجز نہیں ہوسکتی تھی۔

حضرت ادریسؑ کی اولیات: ابن اسحاق نے اپنی کتاب قصص الانبیاء المسمیٰ عرائس المجالس (ص ۶۸) میں لکھا ہے کہ حضرت ادریسؑ پہلے شخص تھے جنھوں نے قلم سے لکھا، پہلے تھے جنھوں نے لباس سیا اور سلا ہوا لباس زیب تن کیا، پہلے تھے جنھوں نے فلکیات (ستاروں کے علم) میں نظر کی اور علم الحساب میں نظر کی۔ نیز یہ کہ اللہ نے ان کو بنی قابیل کی طرف رسول بنا کر بھیجا تھا۔ ابن کثیر (البدایہ والنہایہ ۱: ۱۲۴) نے بھی ابن اسحاق کے حوالہ سے قلم کی ایجاد کی یہ خبر نقل کی ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے یہ حدیث بھی نقل کی ہے کہ حضرت معاویہ بن حکمؓ نے رسول اللہؐ سے خط رمل کے بارے میں سوال کیا تو رسول اللہؐ نے فرمایا کہ حضرت ادریسؑ بے شک ایک رسول تھے جنھوں نے یہ خط ایجاد کیا تھا، لہٰذا جس کا خط ان کے موافق ہوجائے تو اچھا ہے۔ ابن خلدون (مقدمہ ۱: ۲۲۲) رمل کو اوہام وخیالات پر مبنی شے اور اسے محض رمالوں کا گمان قرار دیتے ہیں کہ علم رمل

حضرت ادریسؑ کی ایجاد ہے۔اس رائے کے باوجود انہوں نے بڑی تفصیل سے اس علم کی شرح کی ہے۔ان کے نزدیک اس حدیث معاویہؓ ابن حکم کی شرح یہ ہے کہ جب حضرت ادریسؑ کچھ لکھتے ہوتے تھے اس وقت ان پر وحی آجاتی اور وہ اسے فوراً لکھ لیتے تھے۔اب اگر کسی کی تحریر حضرت ادریسؑ کی اس کتابت وحی سے مل جائے تو وہ درست ہوگی۔یہی حدیث کا منشاء ہے۔

حضرت ادریسؑ کی سب سے اہم ایجاد قلم تھا۔اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کی ایک سورت القلم ہی سے منسوب کی ہے اور اس کی قسم بھی کھائی ہے۔قلم کی ایجاد کا مطلب یہ تھا کہ اس پہلے حضرت ادریسؑ انسانوں کی پہلی بولی کو باقاعدہ زبان کا درجہ دے چکے تھے،یعنی اسے لکھنے اور پڑھنے کے قابل بنانے کے لیے دنیا کے پہلے حروف تہجی الف ب ایجاد کر چکے تھے۔الف ب کی ایجاد کے بعد ہی کوئی زبان لکھے جانے کے قابل بنتی ہے۔کسی زبان کو لکھنے کی پہلی ضرورت قلم دوات اور تختی ہے۔جس قوم کے پاس قابل تحریر زبان اور آلات تحریر موجود ہوں وہ بلند خیالات وافکار کے اظہار پر قادر ہوجاتی ہے اور یہی تہذیب کا سنگ بنیاد ہوتا ہے۔حضرت ادریسؑ نے حساب اور ہندسے ایجاد کیے،فلکیات اور نجوم پر نظر کی،ستاروں کی گردشوں کا حساب لگایا،موسموں اور فصلوں کا اعتبار قائم کر کے حسب حکم الٰہی سال کی مدت بارہ ماہ قرار دی،دنیا کی پہلی تقویم مرتب کی،ہفتہ کے دنوں کو پہلا،دوسرا،تیسرا،چوتھا،پانچواں،جمعہ اور ساتواں کے نام دئے۔اس میں سے کچھ تفصیلات مفسرین قرآن سے ملتی ہیں اور کچھ مصحفہ اخنوخ میں ہیں۔قرآن حکیم میں کہا گیا ہے کہ اللہ کے تحریری قانون میں آغاز تخلیق ہی سے مہینوں کی تعداد بارہ ہے۔(سورۃ التوبہ ۹:۳۶)

تہذیبی ارتقاء کے ساتھ ابلیس اپنے کاموں میں بہت زیادہ سرگرم ہوجاتا ہے۔یہی اس پہلی مکمل تہذیب کے ساتھ بھی ہوا۔البتہ اس تہذیب کے منفی رخ پر بات کرنے سے پہلے اس کے اثباتی عمل پر نظر ڈالنا مناسب ہے۔

قلم اور تحریر کی ایجاد: قلم کی ایجاد اور اس کی قسم کے سلسلہ میں سوائے قرآن حکیم اور احادیث نبویؐ کے ہمارے پاس معلومات کا اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔مصحفہ اخنوخ میں کہیں بھی قلم کی ایجاد کا کوئی ذکر نہیں ہے،سوائے اس کے کہ حضرت ادریسؑ ایک زمانہ میں لکھنا سیکھ رہے

تھے۔ظاہر ہے یہ کام قلم کی ایجاد کے بعد ہی ممکن تھا۔قلم کی انسانی ایجاد سے پہلے اللہ نے اس کی تخلیق کی۔ایک روایت یہ ہے کہ حضرت ادریسؑ کو قلم وحی کیا گیا تھا۔سب سے پہلا قلم خود اللہ تعالیٰ کے حکم سے قیامت تک کائنات کی تقدیریں لکھنے پر مامور ہوا تھا۔اس کا اعلان سورۃ القلم (۶۸: ۱) میں اللہ نے قلم اور تحریر یا تحریر کرنے والوں کی قسمیں کھا کر کیا ہے۔یہ معنی حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت سے تقریباً سبھی ممتاز مفسرین نے لکھے ہیں۔حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ اللہ نے پہلے دوات (ن) اور پھر القلم یا پہلے القلم تخلیق کیا اور اسے لکھنے کا حکم دیا، القلم نے پوچھا کیا لکھوں، حکم ہوا قیامت تک کائنات کی تقدیریں لکھ۔سو القلم لوح محفوظ پر رواں ہو گیا۔امام ابن کثیر (تفسیر ابن کثیر ۲۹: ۵۸۴) نے ابن عساکر کے حوالہ سے ایک حدیث کی روایت میں (ن) سے دوات مراد لی ہے۔امام بغوی (معالم التنزیل ۸: ۱۸۶-۱۸۷) نے لکھا ہے کہ اللہ نے پہلے القلم بنایا پھر اس میں شگاف دیا۔القلم نے اول اللہ کا ذکر لکھا۔اس کے بعد اسے لوح محفوظ پر رواں کیا۔(وما یسطرون) لکھیں بنی آدم کی تقدیریں۔یہ قلم نور کا بنا ہوا تھا اور زمین وآسمان کے برابر لمبا تھا۔امام فخر الدین رازی (تفسیر کبیر مفاتیح الغیب ۱۶: ۶۹-۷۰)، امام بیضاوی (انوار التنزیل ۵: ۳۶۸)، امام محمود آلوسی (روح المعانی ۲۹: ۲۳) اور ابن کثیر (تفسیر ۲۹: ۵۸۵-۵۸۶) نے قلم کی دو تعبیریں بیان کی ہیں: پہلی تعبیر تعظیم کے لیے کہ اس تخلیق ربانی نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے کائنات اور بنی آدم کی تقدیریں لکھیں اور دوسری تعبیر عام جنس قلم ہے۔امام بیضاوی کی دلیل ہے کہ قلم کے کثرت فوائد کی وجہ سے اللہ نے اس کی قسم کھائی ہے۔امام رازی نے اس ذیل میں لکھا ہے کہ:

و کانه تعالیٰ اقسم بکل قلم ، و بکل مایکتب بکل قلم	اللہ نے قسم کھائی ہر قلم کی اور ان سب تحریروں کی جو کچھ ہر ایک قلم تحریر کرتا ہے۔

امام طبرانی نے المعجم الاوسط میں حضرت عبداللہ ابن حارث کی روایت سے حضرت عائشہؓ کی حدیث بیان کی ہے کہ قلم حضرت اسرافیل کے کان پر رکھا ہوا ہے، جب اللہ تعالیٰ وحی نازل کرتے ہیں تو قلم لکھتا ہے اور فرشتے اور اسرافیل اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں (امام جلال الدین سیوطی، الحبائك فی اخبار الملائك ۔ امداد اللہ انور، فرشتوں کے عجیب حالات ۸۷/ دار المعارف، ملتان ۲۰۰۷ء)۔

دو اہم ترین ایجادات: جہاں تک تقدیریں لکھنے والے القلم کا تعلق ہے وہ تو بے شک ایک عظیم ربانی تخلیق ہے اور اسے صرف کاتب تقدیر نے استعمال کیا ہے۔لیکن جنس قلم خود بھی کوئی معمولی ایجاد نہیں۔عام طور سے پہیہ کو سب سے بڑی انسانی ایجاد کہا جاتا ہے اور اس کے تہذیبی، مادی اور سائنسی منافع سے انکار بھی نہیں،لیکن پہیہ سے کوئی روحانی فائدہ متصور نہیں ہے۔حقیقت یہ ہے کہ قلم پہیہ سے زیادہ بڑی ایجاد ہے، کیونکہ پہیہ کے برعکس قلم مادی اور روحانی دونوں قسم کے منافع کا ضامن ہے۔اور یہ جنس قلم حضرت ادریسؑ کی ایجاد ہے جس کی تائید ابن اسحاق کے متذکرہ بالا بیان سے بھی ہوتی ہے۔مصحفہ ۲ اخنوخ،کتاب الاسرار (۱۰:۲۲) میں بیان ہے کہ خواب میں معراج کے دوران اللہ تعالیٰ نے فراوئیل نامی ایک فرشتہ کو حکم دیا کہ خزانۂ ربانی سے کتاب اور واسطی نرکل کا قلم حضرت ادریس کو عطا کیا جائے،اور پھر فراوئیل کے واسطے سے ملنے والی ہدایت کے مطابق وہ تیس دن اور تیس رات تک آسمان زمین سمندر،تمام عناصر اور ان کی گردشوں اور ان سے ہونے والے دھماکوں،سورج چاند ستاروں کی گردشوں،موسموں برسوں دنوں ساعتوں اور ہواؤں اور انسانی زبانوں اور احکام ربانی کی بابت لکھتے رہے (مصحفہ ۲ اخنوخ، کتاب الاسرار ۲۲:۱۰؛ ۲۳:۱-۲)۔

مصحفہ اخنوخ (۱۲:۳) میں انہیں اخنوخ محرر،اور محرر حق کے القاب سے یاد کیا گیا ہے۔بعد میں یہی لقب خود اللہ تعالیٰ نے حضرت ادریسؑ کو خطاب کرتے ہوئے فرمائے:اے راست باز انسان،اے محرر حقانیت (مصحفہ ۱۵:۱)۔ایک مقام پر حضرت ادریسؑ نے اس زمانہ کا اشارہ دیا ہے جب وہ لکھنا سیکھ رہے تھے (مصحفہ ۸۳:۲)۔اس کے باب ۱۳ میں آتا ہے کہ بعد میں حضرت ادریسؑ نے اہل کتاب کے محاورہ میں ''نگراں'' (Watchers) کہلانے والے ''معزول فرشتوں'' (fallen angels) کی درخواست پر اللہ تعالیٰ کے نام ان کی طرف سے معافی کے لیے ایک محضر لکھا (مصحفہ ۱۳:۶/ ۱۴:۴)۔اس کا مطلب صاف ہے کہ حضرت ادریسؑ نے تحریری زبان اور آلات تحریر ایجاد کر لیے تھے اسی لیے ان سے محضر مغفرت تحریر کرنے کی درخواست کی گئی تھی۔

معزول فرشتوں کا تصور بائبلی اقوام میں پایا جاتا ہے اور ان اقوام کا گمان ہے کہ کم و بیش دو سو فرشتے اللہ کی نافرمانی کے باعث معزول ہوئے اور دنیا میں بھیج دیے گئے اسلامی روایات میں

قصہ ہاروت و ماروت کے سوا فرشتوں کی نافرمانی کی ایسی کوئی بات نہیں ملتی۔ اسلامی روایات میں آتا ہے کہ یہ دوسو فرشتے نہیں بنی شیث کے مرد تھے۔ ابن سعد (طبقات الکبریٰ ۱: ۴۷۔ ۴۸) نے یہ قصہ معقول انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ یہ کہ قتل ہابیل کے بعد قابیل کی مسلسل سرکشی کے باعث حضرت آدمؑ نے اولاد شیثؑ کو اولاد قابیل کے ساتھ میل جول رکھنے کی ممانعت کر دی تھی۔ بنی شیث پہاڑوں پر رہتے تھے اور معتوب بنی قابیل میدانی علاقوں کے باشندے تھے۔ ایک بار بنی شیث کے سو افراد کے گروہ نے باہم کہا کہ چلو اپنے ابنائے عم کی خبر لیں۔ چنانچہ وہ پہاڑوں سے اترے۔ بنی قابیل کی عورتیں انہیں اپنی عورتوں سے زیادہ خوبرو نظر آئیں۔ بنی قابیل میں معاصی پھیل چکے تھے۔ قابیلی عورتوں نے ان مردوں کو اپنے دام حسن میں پھانس لیا اور وہ وہیں رہ پڑے۔ کچھ مدت بعد مزید سو افراد اپنے بھائیوں کی تلاش میں پہاڑوں سے اترے اور وہ بھی قابیلی عورتوں کا شکار ہو گئے۔ بائبل میں انہی دوسو افراد کو فرشتے اور عادونائی (العیاذ باللہ، خدا) کی اولاد کہا گیا ہے اور ان کی اولاد کو نیفیلیم اور جبار نسل کہا گیا ہے۔ لہٰذا یہ انسان ہی تھے اور اسی لیے حضرت ادریسؑ سے خواستگار ہوئے تھے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ان کا گناہ معاف کروادیں۔

دنیا کی پہلی تحریری زبان: مصحفہ اخنوخ کے باب ۱۴ میں ذیل کے یہ فقرے زبان سازی، تقریر و تحریر کی سمت اشارہ کرتے ہیں:

''کتاب الفاظ حق اور دائمی معزول فرشتوں کی زجر و توبیخ، بہ مطابق حکم القدوس العظیم الاحد کے جو خواب میں دیا گیا۔ میں نے سوتے ہوئے دیکھا جو کچھ میں اب گوشت کی زبان سے اور اپنے منہ کی سانس سے کہوں گا: جو العظیم الاحد نے انسانوں کو عطا کی ہے تاکہ وہ اس کے واسطہ سے بات کریں اور اپنے دل سے اسے سمجھیں؛ جیسا کہ اس نے انسان کو کلامِ عقل کو سمجھنے کی قوت عطا کی ہے۔ تو اس نے مجھے تخلیق کیا اور مجھے معتوب فرشتوں، ابنائے فلک، کو ملامت کرنے کی قوت دی۔ میں نے تمہارا محضر تحریر کیا، اور میرے خواب میں ایسا ظاہر ہوا کہ تمہارا محضر تمہاری طرف سے قبول نہیں کیا جائے گا'' (مصحفہ ۱۴: ۱۔ ۴) ''اگرچہ تم بول رہے ہو وہ سارے لفظ جو اس تحریر میں درج ہیں جو میں نے لکھی ہے''۔ (مصحفہ ۱۴: ۷)

تحریر کی زبان، قلم، دوات اور تختی کی ایجادیں اولین انسانی تہذیب کے بلند عمرانی مرتبہ

کی دلیلیں ہیں۔لیکن تہذیب کو اس کے ساتھ اور بھی کئی چیزیں درکار ہوتی ہیں۔اصولی طور پر دین و مذہب کے عمرانی ظہور کا نام تہذیب ہے، اگرچہ مورخین کے نزدیک عام طور سے اس کی اثباتی اہمیت نہیں ہے، بلکہ مورخین عموماً تہذیبوں میں پائے جانے والے مشرکانہ عقائد، دیوی دیوتاؤں وغیرہ کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔مثال کے طور پر قدیم مصر کے تاریخی مطالعہ میں مورخین فرعونی عقائد اور اس زمانہ کے مختلف اصنام کی مفروضہ قوتوں پر صفحے سیاہ کرتے ہیں مگر حضرت موسیٰؑ کی رسالت ودعوت کی تاریخی، عمرانی، سیاسی اور اعتقادی اہمیت کو بڑی حد تک نظر انداز کردیتے ہیں۔ تاہم پہلی انسانی تہذیب اس کی دلیل ہے کہ اس کی تشکیل دین کی عمرانی شاخ کے طور پر ہوئی تھی کیونکہ اس کا تصور اور تعمیر دونوں ایک نبیؑ کے عمرانی شعور کا نتیجہ تھی۔ چنانچہ مفسرین قرآن نے حضرت ادریسؑ کی کئی ایجادات کا ذکر کیا ہے۔

ایجادات پر قرآنی شہادتیں:

امام حسین ابن مسعود بغویؒ (۴۳۳-۵۱۶ھ/۱۰۴۱-۱۱۲۲ء) معالم التنزیل (۵:۲) میں سورہ مریم (۵۶:۱۹) کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ حضرت ادریسؑ حضرت نوحؑ کے والد کے دادا تھے،ان کا نام اخنوخ اور لقب ادریس تھا کیونکہ کثرت سے کتب (صحائف ادریس) کی تلاوت کرتے تھے۔ وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے خیاطی کی،قلم سے لکھا،لباس سی کر پہنا جبکہ اگلے لوگ عموماً جانوروں کی کھال اوڑھتے تھے۔انہوں نے اسلحہ ایجاد کیا اور کفار سے قتال کیا۔ وہ پہلے تھے جنھوں نے علم نجوم (فلکیات) اور حساب میں نظر کی۔امام طبری کے حوالہ سے مزید یہ لکھا کہ ان کو بلند مقام پر اٹھانے کا مطلب یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ انہیں دین ودنیا میں بلند مرتبہ دیا گیا اور یہ بھی کہ انہیں چوتھے آسمان پر اٹھا لیا گیا۔

امام محمد الانصاری قرطبی (۱۲۱۴-۱۲۷۳ء) نے اپنی تفسیر الجامع لاحکام القرآن (۱۱:۱۱۷-۱۱۹) میں سورہ مریم (۵۶:۱۹) کی تفسیر میں بتایا ہے کہ حضرت ادریسؑ بن یرد بن مہلائیل بن قینان بن یانش بن شیث بن آدمؑ بنی آدم میں پہلے نبی تھے، انہوں نے اول قلم سے لکھا، کپڑے سئے اور سلا ہوا لباس پہنا اور نجوم وحساب میں نظر کی اور اجرام فلکی کی سیرت کی وضاحت کی۔اللہ نے ادریس کا لقب دیا کیونکہ وہ کتاب اللہ (صحف ادریسی) کا کثرت سے درس دیتے تھے۔

امام عبداللہ بیضاوی (م: ۶۸۲ھ/ ۱۲۸۳ء) انوار التنزیل واسرار التاویل (۲۲:۴) میں سورہ مریم (۱۹: ۵۶-۵۸) کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ وہ اولاد شیثؑ میں نوحؑ کے والد کے دادا تھے۔ ان کا نام اخنوخ تھا اور لقب ادریس، مصدر درس سے مشتق ہے۔ ان پر ۳۰ صحیفے نازل ہوئے تھے۔ وہ پہلے تھے جنہوں نے قلم سے لکھا، علم نجوم اور حساب میں نظر کی۔ اور ان لوگوں میں تھے جن پر اللہ نے دینی اور دنیوی انعامات کیے۔

امام عبداللہ نسفی (م: ۷۰۱ھ/ ۱۳۰۱ء) مدارک التنزیل (۲: ۵۳۲) میں ان آیات سورہ مریمؑ کی شرح میں لکھتے ہیں کہ نام ان کا اخنوخ تھا، آدمؑ کے بعد پہلے رسول ہیں اور پہلے شخص ہیں جنہوں نے قلم سے لکھا اور لباس سیا۔ وہ علم نجوم اور حساب میں گہری نظر رکھتے تھے۔ ترازو اور ناپ تول کے آلات اور اسلحہ ایجاد کیا اور بنی قابیل سے قتال کیا۔ ان پر اللہ نے ۳۰ صحیفے اتارے۔ وَرَفَعْنٰهُ میں مکان سے مراد شرف نبوت اور اللہ کی بارگاہ میں ان کا مرتبہ ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ فرشتے ان کو اٹھا کر (چوتھے آسمان پر) لے گئے تھے، نبی اکرمؐ نے معراج کی رات ان کو دیکھا تھا۔

علم الحساب اور فلکیات کی ایجاد: امام ابوحیان محمد اندلسی (م: ۷۴۵ھ/ ۱۳۴۴ء) سورہ مریم کی ان آیات کی شرح میں (بحر المحیط ۶: ۱۸۸-۱۸۹) لکھتے ہیں کہ ادریسؑ والد نوحؑ کے دادا تھے۔ وہ پہلے تھے جنہوں نے نجوم وحساب میں نظر کی اور اللہ نے انہیں معجزات دیے۔ وہ پہلے تھے جنہوں نے قلم سے لکھا، کپڑا سیا، سلا ہوا لباس پہنا۔ وہ درزی تھے۔ پہلے لوگ کھالیں اوڑھتے تھے۔ حضرت آدمؑ کے بعد پہلے رسول تھے۔ انہوں نے ناپ تول کے پیمانے اور اسلحہ ایجاد کیے اور بنی قابیل سے قتال کیا۔ امام اندلسی نے علامہ محمود زمخشری کا حوالہ دیا جنہوں نے الکشاف میں کہا ہے کہ ان کا لقب عربی لفظ نہیں ہے مگر ان کی اپنی زبان میں ادریس کا مطلب درس کے مفہوم سے قریب تھا، اور کہا جاتا ہے کہ درس سے مشتق ہے اور رفع مکانہ سے مراد شرف نبوت اور اللہ سے قربت ہے۔ دوسرے مفسرین کہتے ہیں انہیں آسمان پر اٹھا لیا گیا تھا۔ یہی حضرت ابن عباسؓ بھی فرماتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ کی طرح انہیں بھی آسمان پر لے جایا گیا۔ ان پر ۳۰ صحیفے نازل ہوئے تھے۔ حضرت کعبؓ بن مالک سے بھی ایسی روایت جسے ابن کثیر (تفسیر ۱۶: ۱۶۸) نے اسرائیلیات میں قرار دے کر قبول نہیں کیا۔ مصحفہ ۲، اخنوخ، کتاب الاسرار (۳: ۱) میں دو فرشتوں

کے ساتھ ان کے سات آسمانوں کے سفر کا حال تفصیل سے بیان ہوا ہے، نیز یہ کہ اس وقت ان کی عمر ۳۶۵ سال تھی۔

امام ابن کثیر (۷۰۰۔۷۷۴ھ/ ۱۳۰۱۔۱۳۷۳ء) نے سورہ مریم ۱۹: ۵۶۔۵۷ کی شرح (تفسیر ۱۶: ۱۶۸) میں کہا ہے کہ حضرت ادریسؑ درزی تھے اور کپڑا سیتے ہوئے سوئی کے ایک ایک ٹانکے پر سبحان اللہ کہتے تھے۔ ابن کثیر نے اپنی تاریخ (البدایہ والنہایہ ۱: ۱۲۴) میں مزید لکھا ہے کہ حضرت ادریسؑ مذکورہ اخنوخ ہی ہیں جن کی صفات نبوت اور صدیقیت ہیں۔ اکثر علمائے تفسیر کہتے ہیں کہ پہلے شخص تھے جنہوں نے دین کے بارے میں وعظ و خطاب کا سلسلہ ڈالا اور ان کو ہرمس الہرامسہ (استاذ الاساتذہ یا حکیم الحکماء) کے نام سے پکارتے تھے۔ ابن خلدون (تاریخ العبر ۱: ۱۹) نے بھی ابن اسحاق کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ادریسؑ وہی نبی ہیں جو فن حکمت میں ہرمس حکیم کے نام سے مشہور ہیں۔ البتہ ابن خلدون نے ان کا تفصیلی ذکر نہیں کیا۔

حکیم الاسلام شیخ طنطاوی جوہری (۱۲۸۸۔۱۳۵۸ھ/ ۱۸۷۰۔۱۹۴۰ء) سورہ القصص کی تفسیر (الجواہر فی تفسیر القرآن الکریم ۱۴: ۹) کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ حضرت ادریسؑ کا لقب ہرمس تھا، اور طبیب، مہندس (انجینئر) اور الٰہیا (عالم الٰہیات) بھی ان کے القاب تھے۔ اس بیان کے مطابق حضرت ادریس علم طب یعنی علاج معالجہ کی سائنس کے موجد بھی تھے۔

شیخ عبدالحق حقانی دہلوی نے سورہ مریم ۱۹: ۵۶۔۵۷ کی تفسیر (تفسیر حقانی رفتح المنان ۵: ۱۷۷۔۱۷۸) میں کہا کہ حنوک یا اخنوخ سچے نبی تھے اور صحف آسمانی کی کثرت درس کی وجہ سے ادریس کہلائے، نیز بہت سے علوم اور صنعتیں ان کے ہاتھ سے ایجاد ہوئیں۔

مولانا مفتی محمد شفیع (۱۸۹۷۔۱۹۷۶ء) (معارف القرآن ۶: ۴۱) مختلف مستند تفاسیر کے حوالوں سے لکھتے ہیں کہ حضرت ادریسؑ اجداد نوحؑ میں تھے (امام محمود آلوسی بغدادی۔ روح المعانی بحوالہ مستدرک حاکم)، حضرت آدمؑ کے بعد پہلے رسول تھے۔ ان پر ۳۰ صحائف نازل ہوئے (حدیث ابی ذر بحوالہ زمخشری)۔ علم نجوم و حساب ان کے معجزات تھے (امام ابو حیان اندلسی۔ بحر المحیط)۔ پہلے انسان تھے جنہوں نے قلم سے لکھنا، کپڑا سینا ایجاد کیا۔ ناپ تول کے طریقے ایجاد کیے۔ اسلحہ ایجاد کیا اور بنی قابیل سے جہاد کیا (بحر المحیط، احکام القرآن، تفسیر مظہری، روح المعانی)۔

وَرَفَعنَا سے مراد نبوت ورسالت اور قرب الٰہی ہے، بعض روایات میں آسمان پر اٹھایا جانا آتا ہے۔

ان مفسرین کے علاوہ ابن اسحاق (قصص الانبیاء المسمیٰ عرائس المجالس ۶۸) نے اہل علم، اخبار ماضی کے ماہرین اور قصص النبیین کے جاننے والوں کے حوالے سے لکھا کہ ان کا نام ونسب تھا ادریس بن یرد (بعض کہتے ہیں اَرید، کچھ روایات میں یارِد) بن مہلائیل بن قینان بن انوش بن شیث بن آدم اوران کا نام اخنوخ تھا اور کثرت سے حضرت آدم وحضرت شیثؑ کی کتب وصحف کا درس دینے کے وجہ سے ادریسؑ لقب پڑا۔اور وہ پہلے تھے جنھوں نے قلم سے لکھا، پہلے تھے جنھوں نے کپڑا سیا اور سلا ہوا لباس پہنا اور پہلے تھے جنھوں نے علم النجوم (فلکیات) اور حساب میں نظر کی۔ اللہ نے انہیں اولاد قابیل کی طرف مبعوث کیا تھا۔ان کی والدہ کا نام اشوت تھا۔ایک دیگر روایت میں ان کا نام برکہ بتایا گیا ہے۔

امام بن جریر طبری (تاریخ الامم والملوک ۱:۱۳۹-۱۴۰) کا بیان ہے حضرت ادریسؑ پر تیس صحیفے نازل ہوئے، انہوں نے ہی باقاعدہ قلم سے لکھنا شروع کیا، سب سے پہلے کپڑوں کی سلائی شروع کی اور قتال فی سبیل اللہ کیا، قابیل کی بدکار اولاد کو گرفتار کیا اور غلامی کی زنجیر میں جکڑ دیا۔امام طبری نے مزید کہا کہ حضرت ابوذر غفاریؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا اے ابوذر، رسولوں میں سے چار سریانی ہیں: آدمؑ، شیثؑ، نوحؑ اور اخنوخؑ اور اخنوخ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے قلم کے ذریعہ لکھائی کی۔ اللہ نے ان پر تیس صحیفے نازل کیے تھے۔اسی روایت میں یہ بھی ہے کہ قرآن حکیم میں جو اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْأُولىٰ (الاعلیٰ ۸۷:۱۸) آیا ہے اس سے مراد حضرت شیثؑ اور حضرت ادریسؑ کے صحیفے ہیں۔

(باقی)

مطالع المحامد

(نقاط اور افعال سے خالی سیرت طیبہ)

پروفیسر محمد انس حسان

سیرت نبویؐ کے ضمن میں اہل علم نے جذبات محبت کے وہ باب رقم کیے ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔مثلاً علامہ عبدالجلیل قیروانی کی کتاب ''شفاءالاسقام'' جس کی خوبی یہ ہے کہ اس کی ہر سطر ایک نئے درود پاک سے شروع ہوتی ہے اور اس خوبی پر مزید کمال یہ ہے کہ یہ کتاب مکمل سیرت نبوی کا احاطہ کرتی ہے۔اسی طرح احمد بن محمد المقری کی ''فتح المتعال فی وصف النعال'' اور رضی الدین ابوالخیر کی ''المرتجی بالقبول خدمۃ قدم الرسول'' خوبی یہ ہے کہ اس میں آپؐ کے نعلین مبارک پر اتنی محققانہ بحث کی گئی ہے کہ چودہ صدیوں میں اس موضوع پر اس طرز کی کوئی اور کتاب نہیں۔مقامات حریری کا اٹھائیسواں مقام ہے کہ جس کی خوبی یہ ہے کہ اس میں کوئی نقطہ نہیں مگر یہ صرف ایک دو صفحات پر مشتمل ہے۔اسی طرح ''مختار البیان فی لغات القرآن'' کے شروع کے تین صفحات اور ''انشائے بے نقاط'' بھی صنعت تعطیل (غیر منقوطہ) میں عمدہ کاوشیں ہیں۔ عربی زبان میں سیرت نبوی پر پہلی غیر منقوط کتاب محمد صدیق لاہوری نے ''سلک الدرر لا کمل الرسل الاطہر'' کے عنوان سے لکھی جو فیضی کی ''سواطع الالہام'' اور ''موارد الکلم'' سے بہتر ہے۔عصر حاضر میں مولانا ولی رازی نے ''ہادی عالم'' کے عنوان سے سیرت نبوی پر اردو نثر میں کتاب لکھی،جس کا کمال یہ ہے کہ پوری کتاب میں کوئی نقطے والا حرف استعمال نہیں کیا۔سیرت نبوی سے متعلق انہی عجائب دہر کتب میں مرزا قدرت اللہ بیگ کی ''مطالع المحامد'' کو بھی بلند مقام حاصل ہے۔چار ہزار پانچ سو اڑتیس اشعار پر مشتمل اس منظوم سیرت کا امتیاز اور انفرادیت یہ ہے

گورنمنٹ ڈگری کالج جہانیاں۔پاکستان

کہ یہ غیر منقوط اور محذوف الافعال ہے۔یعنی نہ تو اس میں کوئی نقطہ استعمال کیا گیا ہے اور نہ ہی کوئی فعل استعمال کیا گیا ہے۔مزید کمال یہ کہ اس کے تقریباً ہر شعر میں کوئی نہ کوئی صنعت (مثلاً صنعت تجنیس وقلب) پائی جاتی ہے۔فنی اور ادبی اعتبار سے یہ کتاب جس درجے اور مرتبے کی حامل ہے، بدقسمتی سے اس کا تعارف عوام تو کیا خواص میں بھی نہیں۔راقم نے اس کتاب کے تعارف کے ساتھ اس کے فنی محاسن اور نقائص کا طالب علمانہ جائزہ لیا ہے تاہم اس جائزے کی حیثیت ادبی فرض کفایہ کی ادائیگی سے زیادہ نہیں۔

مولف کا تعارف: مولوی قدرت اللہ بیگ (مولف: مطالع المحامد) قصبہ ملیح آباد ضلع لکھنؤ کے ایک نہایت قدیم اور شریف گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔مورث اعلیٰ کا نام مرزا سیف اللہ بیگ تھا اور آبائی وطن فتح آباد تھا جو غزنی کے قریب ایک مشہور قصبہ ہے۔ان کا اور نواب حیدر بیگ (نواب آصف الدولہ کے وزیر) کا تعلق ایک ہی خاندان سے تھا۔ان دونوں کے خاندانی تعلقات تغیرات زمانہ کی بدولت بعض وجوہ سے خوش گوار نہ رہ سکے اور منقطع ہو گئے۔مرزا سیف اللہ بیگ اٹھارہ سوسوار کے رسالدار تھے اور ضلع سلطان پور کے ناظم تھے۔ملیح آباد کے قریب قصبہ مرزا گنج انہی کا آباد کیا ہوا ہے۔مرزا سیف اللہ بیگ کا نسب دو بیٹیوں اور ایک بیٹے سے آگے چلا۔بیٹے کا نام رستم بیگ تھا جو والد کے بعد بھی رسالدار رہے۔ان کے دو بیٹے ہوئے جن کے نام بالترتیب مرزا احمد علی بیگ اور مرزا محمد بیگ تھے۔مرزا احمد علی بیگ کے پانچ بیٹے ہوئے جن میں سے ایک مرزا محسن بیگ تھے۔ہمارے ممدوح مرزا قدرت اللہ بیگ ان کے چوتھے نمبر کے بیٹے تھے۔ مولوی قدرت اللہ بیگ کے نانا کا نام محمد جعفر خاں تھا اور ان کے والد کا نام سعادت علی خاں تھا۔ ننھیال کا تعلق آفریدی علی خیل سے تھا جو خیبر سے پہلے مئو فرخ آباد اور پھر ملیح آباد چلے آئے اور یہیں کے ہو رہے۔

مولوی قدرت اللہ بیگ ۱۲۸۷ھ/ ۱۸۷۳ء کو بہ مقام ملیح آباد پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم وہیں سے حاصل کی اور تکمیل کے لیے دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے۔وہ جس دور میں دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے وہ اس کے عروج کا دور تھا اور مولانا رشید احمد گنگوہی (۱۸۲۹ء۔۱۹۰۵ء) جیسے جلیل القدر عالم دارالعلوم میں رونق افروز تھے۔اس بات کا کوئی حتمی ثبوت تو نہیں لیکن غالب

خیال ہے کہ بیگ صاحب نے مولانا کی علمی صحبتوں سے ضرور فیض اٹھایا ہوگا۔ تکمیل کے بعد لکھنؤ کے مشہور و مستند اطباء سے طب کی تعلیم حاصل کی اور اسی دوران سنسکرت میں بھی کافی دستگاہ بہم پہنچائی۔ روحانی تعلق مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی (۱۷۹۲ء۔ ۱۸۶۲ء) سے رہا اور امام ربانی مجدد الف ثانی (۱۵۶۴ء۔ ۱۶۲۴ء)(۱) کے دل و جاں سے متبع تھے۔ ان کو فلسفہ و منطق سے خاص شغف تھا۔ فارسی شاعری میں بھی کمال رکھتے تھے اور تخلص ''راد'' کرتے تھے۔ حصول تعلیم کے بعد تدریس سے منسلک ہو گئے اور مدرسہ عالیہ فرقانیہ لکھنؤ میں تادم آخر فارسی کے مدرس اعلیٰ کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ انتقال کا سن معلوم نہیں لیکن ''**مطالع المحامد**'' کی تالیف کے بعد وہ زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہے اور اس اعتبار سے ان کا وصال ۱۹۴۰ء کے لگ بھگ ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ ایک بیٹی کے علاوہ کوئی اولاد نہ چھوڑی اور یہ بیٹی بھی کم عمری ہی میں داغ مفارقت دے گئیں۔ علمی سرمایے میں ''**مطالع المحامد**'' کے علاوہ ''مثنوی سحر حلال''، ''ابوالفضل'' اور چند درسی کتب ''ریاض فارسی'' اور ''انتخاب فارسی'' یادگار چھوڑی ہیں۔(۲) اسے تاریخ کی ستم ظریفی پر ہی محمول کیا جا سکتا ہے کہ جس طرح ان کی شخصیت ان کی سادگی اور درویشی کی وجہ سے محققین سے پوشیدہ رہی اسی طرح ان کی کتابیں بھی آج ڈھونڈے سے نہیں ملتیں۔

سبب تالیف: مولوی قدرت اللہ بیگ کی واحد اولاد ان کی دختر نور جہاں تھی۔ جسے انہوں نے ''**مطالع المحامد**'' میں ''معصومہ'' کے نام سے ذکر کیا ہے۔ انہیں اپنی دختر سے بے پناہ محبت تھی۔ جو محض دس سال کی عمر میں ان کو تنہا چھوڑ گئی اور ان کی زندگی ویران کر گئی۔ مولوی قدرت اللہ بیگ کو اس واقعہ سے اتنا صدمہ پہنچا کہ سب کچھ ترک کر بیٹھے۔ کچھ افاقہ ہوا تو ٹھان لی کہ اپنی بیٹی کی یاد اور ایصال ثواب کے لیے کوئی ایسا کام کر جائیں کہ دنیا اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہو اور حقیقت یہ ہے کہ وہ ایسا کرنے میں کامیاب بھی ہوئے۔ سبب تالیف کا ذکر کرتے ہوئے مولف نے لکھا ہے کہ:

در ارواء معصومہ و روح مادر مدار معلا مداح والا
در اکرام والد کہ مرد مطہر سر راد درگاہ صدر معلا(۳)

مداح (یعنی مولف) کا اس قصیدے کے لکھنے کا سبب یہ ہے کہ اس کی بیٹی (نور جہاں) اور اس کی

والدہ کی روح کو خدا تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ترو تازہ کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے در دولت پر راد (مولف) نے اپنا سر اس غرض سے رکھا ہے کہ اس کے والد پر بھی کرم کا ابر برسا دے۔

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

ارم کار در مدح صدر اکارم　　مع درد معصومہ مداح والا(۴)

مولف کا دل اپنی بیٹی کی جدائی کے رنج و غم میں مبتلا ہے۔ لیکن پھر بھی وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعریف بیان کر کے اپنے لیے جنت کا سامان پیدا کرنا چاہتا ہے۔

کتاب کا تعارف: مولوی قدرت اللہ بیگ کی کتاب ''مطالع المحامد'' فارسی زبان کی منظوم سیرت ہے جو قصیدے کے طرز میں لکھی گئی ہے (۵) اس کتاب کی خاص بات یہ ہے کہ چار ہزار پانچ سو اڑتیس اشعار میں کوئی لفظ ایسا استعمال نہیں کیا گیا جس میں نقطہ ہو اور نہ اس میں کوئی فعل استعمال کیا گیا ہے۔ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں گنتی کے چند اشعار کے علاوہ کوئی شعر ایسا نہیں جو صنعت تجنیس اور قلب سے خالی ہو۔ غیر منقوط کتب کی تو بعض مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں لیکن محذوف الافعال کتاب کی کوئی نظیر نظر سے نہیں گزری۔ پروفیسر عبد القوی فانی (لکھنؤ یونیورسٹی) نے اس کتاب پر جو مختصر مقدمہ لکھا ہے، اس میں انہوں نے تحریر کیا ہے کہ:

> ''اس کتاب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سوانح مبارک بیان کیے گئے ہیں اور در حقیقت یہ ایک بڑا اعجاز ہے اور ماننا پڑتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تصرف ہے اور آپ کی برکت ہے کہ آپ کے حالات کی کتاب اس شان سے نظم ہو جائے کہ اس میں نہ تو کوئی نقطہ والا لفظ ہو اور نہ کوئی فعل ہو۔ چونکہ ملک سے اب فارسی کا ذوق کم ہو رہا ہے، مجھے اندیشہ ہے کہ بجز معدودے چند با کمال ہستیوں کے جن سے ملک اب بھی خالی نہیں ہے، یونیورسٹیوں کے نام نہاد فارسی کے اعلیٰ درجہ کے سند یافتہ، مولوی صاحب موصوف کے کلام کا ترجمہ شاید ہی کر سکیں۔ سمجھنا اور داد دینا تو بڑی چیز ہے۔'' (۶)

کتاب کے سن تالیف کے بارے میں پروفیسر عبد القوی فانی ہی کے مقدمہ کے ایک جملے سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی تکمیل طباعت سے ایک سال قبل ہوئی اور مقدمہ کے اختتام پر چونکہ تاریخ

۱۲ اکتوبر ۱۹۳۵ء رقم ہے اس لیے اغلب یہ ہے کہ کتاب کی تکمیل ۱۹۳۴ء میں ہو چکی تھی۔ اس کتاب کو لکھنے میں کتنا عرصہ لگا اس کی خبر اس کتاب ہی کے ایک شعر سے ملتی ہے۔

دو سہ سال دوار کلک مطہر در املاء مدح مہہ راد اعلیٰ (۷)

مدح کے قلم نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تعریف لکھنے میں دو تین سال حرکت کی ہے۔

یہ کتاب پہلی اور شاید آخری مرتبہ مطبع یوسفی لکھنؤ سے ۱۹۳۵ء میں طبع ہوئی۔ دو سو پینتیس صفحات پر مشتمل یہ کتاب دیوانی طرز پر شائع کی گئی تھی اور اس کے حاشیے میں بعض مشکل الفاظ کے معنی بھی دیے گئے تھے۔ کتاب پر پروفیسر عبدالقوی فانی کا مختصر مگر جامع مقدمہ ہے، جس میں مولوی قدرت اللہ بیگ کی شخصیت کا عمومی تعارف پیش کیا گیا ہے اور یہ ہماری تحقیق کے مطابق ان کی شخصیت کے متعلق واحد ماخذ ہے۔ یہ کتاب جس دور میں لکھی گئی۔ یقیناً اس دور تک فارسی کی کئی منظوم کتب سیرت لکھی جا چکی تھیں اور ممکن ہے اپنی مسجع و مقفع ترتیب کے اعتبار سے وہ بہتر بھی ہوں لیکن حسن ترتیب، حسن بیان، صنائع و بدائع اور ندرت لفظی میں شاید ہی کوئی فارسی منظوم سیرت اس کے ہم پلہ قرار دی جا سکتی ہو۔ عربی زبان کی وسعت اور الفاظ کی کثرت سے سب واقف ہیں۔ اسی طرح اردو کو لشکری زبان ہونے کے باعث بہت سے درآمدی الفاظ کا ذخیرہ ملا ہے لیکن فارسی زبان کا معاملہ بالکل الگ ہے۔ اس زبان میں نہ تو عربی کی طرح الفاظ کی کثرت ہے اور نہ ہی اردو کی طرح دیگر زبانوں کے الفاظ سمونے کی صلاحیت ہے۔ اگر چہ مولف نے عربی اور ترکی کے بھی بعض الفاظ کو استعمال کیا ہے لیکن یہ تعداد میں کچھ زیادہ نہیں۔ مولف کی کوشش رہی ہے کہ زیادہ تر فارسی ہی کے الفاظ استعمال کیے جائیں۔ قدیم فارسی کے کئی متروک الفاظ کو بھی شامل کر کے انہیں حیات نو بخشی ہے۔ تاہم اتنے محدود ذخیرہ الفاظ میں غیر منقوط اور محذوف الافعال الفاظ کا انتخاب کر کے اتنی طویل سیرت منظوم کر دینا عقل کو حیران کر دینے والا کارنامہ ہے۔

''مطالع المحامد'' کے فنی محاسن اور خوبیاں: پہلے ''مطالع المحامد'' کے فنی محاسن اور خصوصیات کا ذکر کیا جاتا ہے کیونکہ:

فحسن دراری الکواکب لن تری طوالع فی داج من اللیل غیہب

ستاروں کی جگمگاہٹ اس وقت بہت خوب دکھائی دیتی ہے جب وہ اندھیری رات میں طلوع کریں۔

غیر منقوط ومحذوف الا فعال سیرت: غیر منقوط کتب کی روایت میں یہ کتاب اگر چہ کوئی پہلی اور آخری کتاب نہیں اور اس سے قبل اور بعد میں بھی بعض کتب بغیر نقطے کے تحریر کی گئی ہیں۔ (۸) لیکن فارسی کی منظوم سیرت نگاری میں اس کتاب کو اولیت حاصل ہے۔ نیز اس کی دوسری بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں کوئی فعل استعمال نہیں کیا گیا۔ عربی زبان اپنی وسعت اور تنوع کے اعتبار سے جبکہ اردو زبان کثیر لسانی زبان ہونے کے باعث شاید فارسی کی بہ نسبت زیادہ ذخیرہ الفاظ رکھتی ہیں۔ نیز اگر اس موجودہ ذخیرہ الفاظ سے افعال بھی نکال لیے جائیں تو یہ ذخیرہ اور بھی کم ہو جاتا ہے۔ اس کے باوجود مولف نے اتنا اور ایسا طویل قصیدہ تحریر کر دیا ہے۔ جسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت مبارکہ کے اعجاز کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ نمونے کے طور پر چند اشعار پیش خدمت ہیں۔

۱۔ مکسر سر کلک داراء عالم در املاء احوال سالار اعلا

خدا تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعریف انتہا کو پہنچادی اور اب اس سے زیادہ تعریف ممکن ہی نہیں۔

۲۔ گل اولیٰ کلک رسّام عالم در اول دور داماءِ دارا

مصور قدرت کے قلم سے جو پہلا پھول پیدا ہوا وہ رسول اللہ ہیں اور بحر ذخار ذات سے جو پہلا موتی ظاہر ہوا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔

ممہّد ہمہ کارگاہِ دو عالم در اسرار مہر مہہ راد اعلا(۹)

خدا تعالیٰ نے دونوں جہاں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت میں بنائے اور انہیں وسعت دی۔

صنائع وبدائع کا استعمال: جب کلام میں ظاہری و باطنی خوبیاں اور لفظی ومعنوی صنعتیں پیدا کی جائیں تو کلام میں صنعت گری کا انحصار علم بدیع پر ہوتا ہے۔ فارسی نظم میں کلام کی فصاحت و بلاغت میں صنائع وبدائع اور جدت طرازی کو ایک مقام حاصل ہے اور اسی کے پیش نظر فارسی کے نامور شعراء نے اپنے کلام میں اس کو خصوصی اہمیت دی ہے۔ مولف نے اس قصیدے میں صنائع وبدائع کے وہ موتی پروئے ہیں کہ انہیں نظروں سے چننے کو جی چاہتا ہے۔ ہمارے ممدوح نے کمال یہ دکھایا ہے کہ اتنے طویل قصیدے میں گنتی کے چند اشعار کے علاوہ ہر شعر میں کوئی نہ کوئی صنعت موجود ہے۔ اس ضمن میں صنعت تجنیس (۱۰)، صنعت قلب (۱۱) اور صنعت اشتقاق (۱۲) کا بڑی خوبی، شگفتگی اور روانی سے استعمال کیا ہے۔ بطور نمونہ چند مثالیں پیش خدمت ہیں۔

۱۔ ہموم معلاء دور دوائر ہمہ موم در مہر داراء اعلاء(۱۳)

گردشِ دوراں سے جو عظیم مصائب پیدا ہوتے ہیں وہ سب محبت الٰہی کے سبب موم کی طرح نرم ہو جاتے ہیں۔

''ہموم'' میں دو طور پر ''موم'' کا لفظ موجود ہے۔ اول یہ کہ ''ہموم'' کی ''ہ'' ساقط کرنے پر ''موم'' رہ جائے گا۔ دوسرے یہ کہ ''ہموم'' اور ''موم'' میں صنعت قلب ہے۔ صنعت تجنیس وقلب کے علاوہ اس میں ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ دوسرے مصرعہ میں ''ہمہ'' کی آخری ''ہ'' جب ''موم'' کی پہلی میم کے ساتھ ملا کے پڑھی جائے گی تو پھر ''موم'' سے ''ہموم'' ہو جائے گا اور ''ہ'' کو اگر ساقط کر دیا جائے تو ''ہم'' ہو جائے گا۔ ''ہم'' اور ''ہموم'' میں صنعت اشتقاق ہے۔ ان تینوں صنعتوں کے علاوہ اس شعر میں صنعت ایہام بھی پائی جاتی ہے کیونکہ ''دور دوائر'' کے الفاظ اس کے مقتضی ہیں کہ ''مہر'' کے معنی آفتاب کے ہوں گے حالانکہ یہاں ''مہر'' کے معنی محبت ومودت کے ہیں۔

۲۔ مع آہ ہر کاہ در دردِ داور مکسر در آلام ہر رمل صحرا(۱۴)

خدا تعالیٰ کے درد محبت میں گھاس کا ہر تنکا آہ وزاری کر رہا ہے اور صحرا کی ریت کے ذرے پراگندہ و منتشر ہو رہے ہیں۔

''آہ'' اور ''کاہ'' میں صنعت تجنیس ہے اور اسی طرح ''در'' اور ''درد'' میں بھی صنعت تجنیس ہے کیونکہ ''در'' کی را جب ''درد'' کی پہلی دال سے ملے گی تو لفظ ''درد'' بن جائے گا۔

رد دار ارد الٰہ مکرم در اسرار مہر مہہ راد اعلا(۱۵)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سچی محبت کرنے سے خدا تعالیٰ کا قہر وغضب دور ہو جاتا ہے۔

''دار'' اور ''رد'' میں صنعت قلب ہے جبکہ ''ارد'' اور ''در'' میں صنعت تجنیس ہے۔ ''دار'' اور ''ارد'' میں صنعت قلب غیر مرتب ہے جبکہ ''دارا'' اور ''دار'' میں صنعت قلب مرتب ہے۔ ''راد'' اور ''رد'' میں صنعت تجنیس ہے اور ایک لحاظ سے صنعت اشتقاق بھی ہے۔ ''مہر'' اور ''مہ راد'' میں صنعت تجنیس ہے کیونکہ ''مہہ'' کی ''ہ'' جب ''راد'' کی را سے ملے گی ''مہر'' کا لفظ بن جائے گا۔

مع ماہِ روءِ رسولِ مکرم مِہام معلاء داراء اعلا(۱۶)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عالم کائنات کی علت غائی ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کی محبت میں خدا تعالیٰ نے عالم

کائنات کو وجود بخشتا ہے۔

''مہام'' اور ''ماہ'' میں صنعت قلب ہے۔ ''مہام'' میں لفظ ''مہہ'' شامل ہے اور ''مہہ'' مخفف ہے ''ماہ'' کا۔ ''مہام'' کے حرف الٹے جائیں تو ''مہام'' سے ''ماہ'' ہوجائے گا۔

ارم کار در مدح صدر اکارم مع درد معصومہ مداح والا (۱۷)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مداح (مولف) باوجودیکہ اپنی بیٹی کی جدائی کے رنج و غم میں ڈوبا ہوا ہے لیکن پھر بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعریف بیان کرکے اپنے لیے بہشت تیار کررہا ہے۔

''ارم کار'' اسم فاعل سماعی ہے۔ ''اکارم''، ''ارم'' اور ''کار'' میں صنعت تجنیس ہے۔ اسی طرح ''در'' اور ''درد'' میں بھی صنعت تجنیس ہے۔

فصاحت و بلاغت اور ایجاز بیان: فصاحت علم معانی میں مشکل و ثقیل الفاظ اور غیر مانوس ترکیبات سے پاک کلام کو کہتے ہیں۔ جبکہ کم از کم الفاظ میں وسیع مضمون کا احاطہ کرلینا بلاغت کہلاتا ہے۔ گویا فصاحت کی انتہا بلاغت ہے۔ ''مطالع المحامد'' سے قبل کی کتب منظومہ میں اطناب و طوالت کا اسلوب غالب نظر آتا ہے مگر برصغیر میں شبلی اور حالی کی کوششوں نے ایجاز و اختصار کے ضمن میں فصاحت و بلاغت کے حقیقی مفہوم کا تعارف کروایا۔ مولف ''مطالع المحامد'' نے طویل مضمون کو مختصر الفاظ میں بیان کرنے کی اسی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ رعایت لفظی اور ترکیبی خوبیوں کے باعث اس کتاب کو بلند مقام حاصل ہوا ہے۔ چند نمونے ملاحظہ فرمائیں۔

۱۔ ابوجہل نے ایک موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بے ادبی کی تو حضرت حمزہؓ نے اس کی خوب خبر لی۔ اس واقعہ کو سیرت نگاروں نے بالعموم اور منظوم سیرت نگاروں نے بالخصوص غیر معمولی اہمیت دی ہے اور اس کے بیان میں بہت زیادہ طوالت سے کام لیا ہے لیکن مولف کی رعایت لفظی دیکھیے:

عم صدر اعلا در امداد سرور مکسر سروگام سردار اعلا (۱۸)

حضرت حمزہؓ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حد درجہ محبت رکھتے تھے ان کی حمیت و جرأت نے ابوجہل کی عزت وافتخار کو نیست و نابود کردیا۔

۲۔ ہجرت مدینہ کے موقع پر جب نبی کریمؐ اپنے گھر سے نکلے ہیں اور حضرت ابوبکرؓ کے گھر کی جانب روانہ ہوئے ہیں تو آپؐ کی زبان پر کلام الٰہی جاری تھا اور آپؐ نے مٹی پر آیات مبارکہ

پڑھ کر کفار کی طرف پھینکا جس سے وہ اندھے ہو گئے۔ اس واقعہ پر ہمارے منظوم سیرت نگاروں نے بڑی تفصیل سے کام لیا ہے۔ لیکن مولف کی معجز بیانی دیکھیے کہ کلام الٰہی کو خدا کے ناقابل تسخیر قلعے سے تشبیہ دے کر بات ہی ختم کر دی ہے۔

کلام معلاء دارا عالم حصار معلاء سالار اعلا(۱۹)

خدا تعالیٰ کا کلام دشمنان دین سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حفاظت کے ضمن میں ایک مضبوط اور ناقابل تسخیر قلعہ بن گیا۔

سادگی و تاثیر سادگی سے مراد یہ ہے کہ جو مضمون شعر میں ادا کیا جائے وہ بلا تکلف سمجھ میں آ جائے۔ چنانچہ ضروری ہے کہ جملوں کی اصلی نحوی ترتیب قائم رکھی جائے یعنی بحر و قافیہ کی ضرورت سے اجزائے کلام اپنی مقررہ جگہوں سے زیادہ ہٹنے نہ پائیں۔ لیکن سادگی و سلاست کے ساتھ ساتھ مضمون کی دل نشینی، جدت طرازی اور موسیقیت کے اجزائے ثلاثہ اگر موجود نہ ہوں تو شعر میں تاثیر پیدا نہیں ہوتی۔ نمونہ کے طور پر واجد علی شاہ کا یہ شعر دیکھیے:

ضیاء بخش قندیل حب حرم کرم کر کرم کر کرم کر کرم(۲۰)

۱۔ یہی خوبی "مطالع المحامد" میں بھی ملتی ہے۔ اس شعر میں دیکھیے کہ "لولو" اور "لالہ" نے کیسی موسیقیت بھر دی ہے۔ نیز "دوائر" پہلے مصرعے کے آخر میں اور دوسرے مصرعے کے شروع میں بہت عمدگی سے لایا گیا ہے۔

مصور ارم در مدار دوائر دوائر ہمہ طاس لولوء لالہ(۲۱)

کرہ زمین بالکل بہشت کی تصویر معلوم ہوتا تھا اور آسمان بالکل موتیوں کا طشت معلوم ہوتا تھا۔

۲۔ سادگی و تاثیر کا مرقع یہ شعر دیکھیے جس میں "گرد" کے تکرار نے صوتی حسن کو اور بھی دلکش بنا دیا۔

سما گرد گام رسول مکرم سما گردِ گردِ مہہ راد اعلا(۲۲)

آسمان آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے قدموں کی خاک ہے جو ہر لمحہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر قربان ہونے کے لیے تیار ہے۔

تشبیہات و استعارات: منظوم کتب سیرت میں تشبیہ و استعارہ کو خصوصی اہمیت حاصل رہی ہے۔ "مطالع المحامد" میں جہاں صوتی اور صوری اثرات اور موسیقیت نے اس کے شعری محاسن

میں اضافہ کیا ہے وہاں تشبیہ و استعارہ و کنایہ نے اس کی فصاحت و بلاغت میں اضافہ کر دیا ہے۔ ذیل میں چند مثالیں پیش خدمت ہیں:

مساء و سحر ہر دو در روءِ داور طلوع مہہ و مہر و روءِ مطرا
مساء سحر موءِ معلاء عالم سحر سحر روءِ مہہ راد اعلا (۲۳)

چاند اور سورج دونوں آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے چہرے سے طلوع کیے جاتے ہیں۔ رات آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زلفوں کے زیر اثر ہے اور صبح آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے چہرے کی تجلی سے روشن ہوتی ہے۔

مہہ رادِ عکس الله مطہر ہمہ دہر در عکس مردِ معلا
عمود سحر لمعۂ روءِ داور مہہ و مہر دوّار در عکس والا (۲۴)

آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اس کائنات پر خدا تعالیٰ کا سایہ ہیں اور تمام کائنات آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زیر سایہ ہے۔ صبح کی روشنی کا عمود آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے چہرۂ مبارک کی ایک کرن کی مانند ہے اور یہ چاند اور سورج جو زمانے میں حرکت کر رہے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے عکس کے پرتو ہیں۔

حب رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی فراوانی: ایک نثر نگار کے ذہن میں واقعات کی ترتیب اور ثقاہت کی فکر دامن گیر ہوتی ہے اور اسی باعث اس کے اندازِ بیاں میں بسا اوقات چاشنی اور حلاوت کا فقدان نظر آتا ہے۔ جبکہ نظم نگار بڑی خوبی سے ان جکڑ بندیوں سے آزاد ہو کر اپنی پرواز تخیل کو بلند تر کرتا چلا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ منظوم کتب سیرت کا وہ سرمایہ جس میں مجلسی ضروریات کو دخل نہیں، اس میں حب رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اثرات کو واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ "مطالع المحامد" کی بنیاد اور اساس عشق رسول پر استوار ہے اور اس کی مثالیں کتاب میں جا بجا ملتی ہیں۔ مولف کے قلم نے عشق رسول کے جو موتی پروئے ہیں انہیں آنکھوں سے چننے کو جی چاہتا ہے۔ پوری کتاب عشق رسول کے جذبہ صادق سے مملو ہے لیکن اس کیف و سرور اور سرمستی و نشاط میں بھی حدود ادب سے تجاوز نہیں کیا گیا۔ نمونے کے طور پر چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

۱۔ مولف کے مطابق وہ شخص سچا مسلمان نہیں ہو سکتا جس کا دل عشق رسول سے سرشار نہ ہو۔ ایسے کم نصیب کو مولف مردہ دل تصور کرتے ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تعریف کی سعادت سے محروم ہو۔

ہمہ اہل دل در رہِ مدح سرور ہمہ مردہ دل کاہل مدح والا (۲۵)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدحت بیان کرنا تو اہل دل کا پیشہ ہے اور وہ شخص جو مدحت بیان کرنے میں سستی کرتا ہے وہ تو مردہ دل ہے۔

۲۔ وہ رسول اللہؐ کی مدحت کو ہر درد کی دوا قرار دیتے ہوئے واضح کرتے ہیں کہ:

دواء ہمہ درد در مہر سرور رہ مہر سرور مراح مطرا (۲۶)

رسول اللہؐ سے عشق ہر ایک درد کی دوا ہے اور آپؐ کی محبت ہی میں ہر طرح کی راحت اور سکون ہے۔

اصحاب رسولؐ کی مدحت: نبی کریمؐ کی محبت وعقیدت کے ساتھ اصحاب رسول سے محبت والفت بھی ایمان کا تقاضا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اٹھارہویں صدی سے لے کر بیسویں صدی کے آغاز تک جو منظوم کتب سیرت لکھی گئیں ان میں اصحاب رسول کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ اگر چہ یہ ایک عمدہ روایت تھی کہ رسول اللہؐ کی ذات گرامی کو جماعت صحابہ سے جدا کر کے پیش نہ کیا جائے۔ تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس دور کی بعض کتب سیرت میں فضیلت کے باب میں ترجیح وتقدیم کے نامناسب الفاظ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منسوب کر دیے گئے ہیں۔ مثلاً امام بخش ناسخ سیرت کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

کہتے بخن بخن آئے وہاں عمر سب سے افزوں تر ہوئے شاداں عمر (۲۷)

حضرت عمرؓ پر بہتان طرازی کی جسارت کی گئی کہ وہ رسول اللہؐ کی وفات پر نعوذ باللہ بہت شاداں وفرحاں تھے۔ اسی طرح یہ دیدہ دلیری کہ حضرت علیؓ کو نعوذ باللہ مشرک اور بت پرست قرار دے دیا گیا۔

جب فراغت اوس سے حضرت پا چکے پھر علی جیو اون سے یہ کہنے لگے
سامنے کوئی تمہارے بت نہ تھا شرط خدمت کرتے تھے کس کی ادا (۲۸)

''مطالع المحامد'' کی خوبی ہے کہ مولف نے بڑی عمدگی سے اس افراط وتفریط سے دامن بچایا ہے۔ پوری کتاب میں مولف موقع کی مناسبت سے اصحاب رسول کی مدحت کرتے نظر آتے ہیں اور خلفائے راشدینؓ کی مدحت میں الگ الگ عنوانات قائم کر کے ان کی خصوصیات کو اجاگر کرتے ہیں۔ اصحاب رسول کی فضیلت میں ترجیح وعدم ترجیح کی سوچ کے برعکس مولف کی رائے یہ

ہے کہ:

در اہواء آلاءِ داراءِ داور ہوا دار سالار اہلِ مدارا(۲۹)

خدا تعالیٰ کی خوش نودی اور انعامات کے حصول کی خواہش اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دوستی اور محبت میں تمام اصحاب رسول یکساں ہیں۔

۱۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے تعلق سے مولف نے بیالیس اشعار میں ان کی مدحت بیان کی ہے۔ اس کے علاوہ غار ثور کے موقع پر حضرت ابوبکر صدیقؓ کی رسول اللہؐ کے ساتھ محبت اور وارفتگی کا نقشہ بھی بڑی عمدگی سے کھینچا ہے۔ غارِ ثور میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آرام فرما رہے تھے تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس پرانے غار کے سوراخوں کو اپنے کپڑوں سے بند کر دیا مگر ایک سوراخ باقی رہ گیا اور اسے حضرت ابوبکرؓ نے اپنی ایڑی سے بند کر دیا۔ اس سارے واقعے کو مولف نے یوں منظوم کیا ہے۔

در اسرار مہر رسولِ اکارم ہمہ کا سر حلّہ مرد معلا

ہمہ کسر مملو مگر کسرِ واحد معراء حلہ در اسرارِ دارا

کلاہِ ہمہ کسر گام مطہر در اسرار مہر مہہ رادِ اعلا(۳۰)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت میں حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے تمام کپڑے نوچ ڈالے اور ان سے تمام سوراخوں کے منہ بند کر دیے مگر ایک سوراخ باقی رہ گیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنی ایڑی کو اس سوراخ کی دستار بنا دیا۔ یعنی اس سوراخ کو اپنی ایڑی سے بند کر دیا۔

۲۔ حضرت عمرؓ کی مدحت میں مولف نے ایک سو ستر اشعار نذر کیے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت واطاعت کی جو مثال قائم کی اس پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ چند اشعار پیش خدمت ہیں:

عمر محور روح صدر دو عالم مدار عمر مہر آل معلا

اسد صدر صدر معلاءِ سرور سو راءِ سرور مع راءِ اعلا(۳۱)

حضرت عمرؓ رسول اللہؐ کی خوشی کا محور ہیں اور حضرت عمرؓ کی محبت کا مدار رسول اللہؐ کی آل ہے۔ حضرت علیؓ آپؓ کی مسند کے صدر نشین تھے اور حضرت عمرؓ کی رائے حضرت علیؓ کی رائے کے موافق ہوتی تھی۔

۳۔ حضرت عثمان غنیؓ کی مدحت میں مولف نے پچیس اشعار قلم بند کیے ہیں۔

مدار الورع عالم السر داور ذُر آراءِ آواءِ داراءِ اعلا
دم صدر اعلاء دہر ممہّد گل و لالۂ لوح داراءِ اعلا (۴۲)

حضرت عثمان غنیؓ پرہیزگاری کا مدار، اسرار الٰہی کے جاننے والے اور قرآن کریم کو موتیوں سے سجانے والے ہیں۔ آپؓ کے خون کے مقدس قطرات نے گل و لالہ بن کر قرآن کو مصور اور رنگین کر دیا۔

۴۔ حضرت علیؓ کی مدحت میں مولف نے سینتیس اشعار تحریر کیے ہیں۔

در علم و داماءِ اسرارِ دارا عطاط المعارک در اہوال اعدا
مساء ہمہ دور دہر ممہّد ہمہ مطلع مہر در راءِ والا (۴۳)

حضرت علیؓ علم کا دروازہ اور اسرارِ الٰہی کا سمندر تھے۔ جنگ میں آپؓ مثل شیر بہادری کے جوہر دکھاتے تھے۔ اس وسیع زمانے کی شب تاریک آپؓ کی رائے سے مطلع خورشید ہو گئی تھی۔

آل بیت سے محبت وعقیدت: اس منظوم سیرت میں آل بیت اطہار سے محبت و عقیدت کے جذبات بھی واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس قصیدے میں مولف نے آل بیت سے محبت کا حق ادا کر دیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ پروفیسر عبدالقوی فانی جو شیعہ مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں، وہ لکھنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ:

> ''قدرت اللہ بیگ راد قزلباش ملیح آبادی نے جو ایک انتہائی سخت اور متعصب سنی ہیں، اس قصیدہ میں آلِ اطہار کی انتہائی زور میں تعریف کی ہے۔ اس سے مقصود ان کا یہ ہے کہ سنیوں کا یہی (حقیقی) اعتقاد ہے۔ اس کے خلاف جو کچھ کہا جائے وہ بالکل غلط اور اتہام ہے''۔ (۴۴)

واقعہ کربلا میں امام حسینؓ کی الم ناک شہادت کو نظم کے پیرایہ میں بڑے افراط و تفریط سے بیان کیا گیا ہے۔ تاہم مولف نے حضرت امام حسینؓ کی محبت وعقیدت میں جو ایک سو ایک اشعار تحریر کیے ہیں ان میں اس قسم کی موجودگی نہیں۔ وہ لوگ جو حضرت عمرؓ کے حوالے سے یہ غلط رائے رکھتے ہیں کہ انھوں نے آل بیت اطہار کا حق خلافت سلب کیا تھا ان کے اس غلط نظریے کو مولف نے حضرت حسینؓ کی تعریف کے ضمن میں اس طرح بیان کیا ہے کہ تمام اشکال دور

ہوجاتے ہیں۔

مروح دل راد مرد مطہر در آرام آل مہہ راد اعلا(۳۵)

رسول اللہؐ کی آل کے آرام اور راحت سے حضرت عمرؓ کے دل کو انتہائی راحت اور سکون ملتا تھا۔

مولف نے آل بیت اطہار کی محبت وعقیدت میں اپنے جذبات کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے مگر اس خوبی سے کہ کسی بھی قسم کے تاریخی وفروعی اختلاف کو درآنے کی اجازت نہیں دی۔

''مطالع المحامد'' کے نقائص اور خامیاں: ''مطالع المحامد'' اپنے فنی محاسن اور انفرادیت کے باعث منظوم سیرت نگاری میں ایک جداگانہ مقام رکھتی ہے۔ مرزا قدرت اللہ بیگ نے اپنے دور کے ادبی اسلوب کو اس کتاب میں بڑی خوبی سے سمویا ہے۔ تاہم وہ بھی ایک انسان تھے

ومن ذا الذی ترضیٰ سجایاہ کلھا کفی المرء نبلاً ان تعد معائبہ

ایسا کون ہے جس کے جملہ اخلاق ہی عمدہ ہوں، کسی آدمی کے شرف وفضیلت کے لیے یہی کافی ہے کہ اس میں گنتی کے عیب ہوں۔

اس کتاب میں اگرچہ ادبی نقائص اور علمی خامیاں نہ ہونے کے برابر ہیں لیکن جو ہیں وہ پیش خدمت ہیں۔

موضوع روایات: مجموعی اعتبار سے اس کتاب میں موضوع اور کمزور روایات بہت زیادہ نہیں۔ مولف نے حتی الامکان موضوع روایات سے اجتناب برتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود چند کمزور روایات کتاب میں درآئی ہیں۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں:

ہمہ مردم دور دار مکرم در احرام درگاہ سالارِ اعلا(۳۶)

آپؐ کے دور میں خانہ کعبہ کے تمام مجاوروں نے خانہ کعبہ کو چھوڑ کر دارالنبوت کا احرام باندھ لیا تھا۔

یہ بات خلافِ واقعہ ہے کیونکہ خانہ کعبہ کے مجاور تو آپؐ کے دشمن ہو گئے تھے۔ اس بناء پر دارالنبوت کا احرام باندھنے کا کیا معنی ہوگا۔

سوم ماہ در دورہ ماہِ کامل دوکم مائل دہر سالار اعلا(۳۷)

قمری سال کے تیسرے مہینے ربیع الاول کے دوکم چودہ (یعنی بارہ ربیع الاول) کو آپ ﷺ اس دنیا میں تشریف لائے۔

ابونعیم، قسطلانی اور سیوطی وغیرہ نے ابن ہشام اور طبری کے حوالے سے ۱۲ ربیع الاول کو آپ ﷺ کی تاریخ ولادت قرار دیا ہے۔(۳۸) بعدازاں ان ہی کی روایات کتب میلاد میں رقم ہوتی چلی گئیں۔تاہم جدید تحقیق کے مطابق جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں آپ ﷺ کی تاریخ ولادت ۹/ربیع الاول ہے اور یہی درست بھی ہے۔(۳۹) مولف نے اس روایت کے بیان میں زیادہ تحقیق برداشت نہیں کی۔

در اہوال صدر معلاء عالم مکسر ہمہ دور درگاہِ کسریٰ(۴۰)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت کے سبب کسریٰ کے محل پر زلزلہ آیا اور اس میں دراڑیں پڑ گئیں۔

اس روایت کا مرکزی راوی مخزوم ابن ہانی ہے جو ابن حجر کے نزدیک مجہول ہے۔(۴۱) سید سلیمان ندویؒ کے مطابق ہانی کی عمر ڈیڑھ سو برس بتائی جاتی ہے، جبکہ اس نام کا کوئی صحابی، جو مخزومی اور قریشی ہو اور اس کی عمر ڈیڑھ سو برس ہو، معلوم نہیں۔(۴۲) بنیادی طور پر یہ روایت ابونعیم اور قسطلانی کے حوالے سے نقل ہوئی ہے، جن کا اپنا کوئی استنادی مقام نہیں ہے۔

در اسرار موءِ رسولِ مکرم مع آل ہر ام مکسور و دروا(۴۳)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بالوں میں اللہ تعالیٰ نے یہ تاثیر دی تھی کہ بانجھ عورتیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بالوں کو پانی میں بھگوتی تھیں تو اس پانی کے پینے سے ان کے ہاں بچہ پیدا ہوتا تھا۔

اس روایت کے متعلق کیا کہا جا سکتا ہے جسے کسی ضعیف روایت کے مجموعے میں بھی کسی نے بیان نہیں کیا۔

(باقی)

حوالہ جات وحواشی

(۱) مرزا قدرت اللہ بیگ کو حضرت مجدد الف ثانی سے حد درجہ محبت وعقیدت تھی اور اس کا اظہار انہوں نے ''مطالع المحامد'' میں بھی کیا ہے۔مثلاً ایک جگہ فرماتے ہیں:

مہہ راد احمد امام مکارم امام معلاء داراء اعلا
سر راد و گام امام مکرم دل راد داماء مہر مطرا

شیخ احمد سرہندی مکارم اخلاق کے ایک برتر اور اعلیٰ امام ہیں نیز اولیاء کرام کے برتر امام اور پیشوا ہیں۔ راد (مولف) کا سر امام ربانی کے قدموں میں ہے اور راد کے دل میں امام ربانی کی محبت کا دریا موجزن ہے۔

(۲) ''مثنوی سحر حلال'' (فارسی) انوار المطابع لکھنو سے شائع ہوئی تھی۔ راقم کے پاس اس کی تیسری اشاعت کا نسخہ ہے، جس پر سن ۱۹۶۱ء درج ہے۔ یہ کتاب ۹۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ ''ابوالفضل'' کوشش بسیار کے باوجود مل نہیں سکی۔ ''ریاض فارسی'' اور ''انتخاب فارسی جدید'' دونوں درسی کتب ہیں۔ یہ دونوں کتب بھی انوار المطابع لکھنؤ سے طبع ہوئی تھیں۔ اول الذکر کے صفحات ۴۴۵ اور ثانی الذکر کے صفحات ۱۶۵ ہیں۔ ان دونوں کتب میں قدیم فارسی نظم و نثر کا بہترین انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ (۳) راد، قدرت اللہ، مرزا، مطالع المحامد، لکھنؤ، مطبع یوسفی، ۱۹۳۵ء، ص ۵۸۔ (۴) مرجع سابق، ص ۲۷۔ (۵) مرزا قدرت اللہ بیگ نے اپنی کتاب ''مثنوی سحر حلال'' کے ایک ذیلی نوٹ میں اپنے اس قصیدے کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''اصل میں یہ قصیدہ دس ہزار اشعار کا ہے''۔ (مثنوی سحر حلال، ص ۱۱) لیکن راقم نے مکمل کتاب کے اشعار کو خود گنا ہے اور اس لحاظ سے کتاب میں موجود اشعار کی تعداد ۴۵۳۸ ہے۔ تاہم مولف نے اپنی کتاب میں کاتب کی بے ایمانی کا جو رونا رویا ہے ممکن ہے اس نے اشعار حذف کر دیے ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ پروفیسر عبدالقوی فانی جن کی تحریک اور سرمایہ سے یہ کتاب طبع ہوئی انہوں نے کتاب کے حجم کے پیش نظر معتدبہ حصہ طبع نہ کیا ہو۔ (۶) راد، قدرت اللہ، مرزا، مطالع المحامد (مقدمہ)، ص ۳۔ (۷) مرجع سابق، ص ۱۶۳۔ (۸) مثلاً: ''مسلک الدر الاکمل الرسل''، ''سواطع الالہام'' اور ''ہادی عالم'' وغیرہ۔ تفصیل کا موقع نہیں ورنہ یہ موضوع خود ایک مضمون کا تقاضا کرتا ہے۔ (۹) راد، قدرت اللہ، مرزا، مطالع المحامد، درج ذیل صفحات دیکھئے: ۶۷۔۵۷۔۴۵۔ (۱۰) علم بدیع کی اصطلاح میں دو یا دو سے زائد ہم شکل لفظوں کو مختلف معنوں میں استعمال کرنے کو ''تجنیس'' کہتے ہیں۔ اس کی مختلف اقسام ہیں:

تجنیس تام: دو یا دو سے زائد متفق اللفظ اور مختلف المعنی کلموں کا ایک جگہ آنا۔

تجنیس خطی: جس میں الفاظ کی شکلیں ایک جیسی ہوں لیکن نقطوں میں فرق ہو۔

تجنیس زائد: جس میں ایک کلمہ دوسرے کلمے سے ایک یا دو حرف زائد ہو۔

تجنیس قلب: جس میں دوسرے کلمے کے حرف الٹ کر آئیں۔

تجنیس مرکب: جس میں ایک کلمہ نصف لفظ سے بنے۔

تجنیس مزدوج: جس میں ایک کلمہ دو لفظوں سے حاصل ہو۔

تجنیس مطرف: جس میں حرکات کا اختلاف ہو۔

(۱۱) صنعت قلب علم بیان کی ایک صنعت ہے، اس کی خاصیت یہ ہے کہ کسی لفظ، کلمہ یا عبارت کو الٹا کر کے پڑھا جائے تب بھی وہ ویسا ہی ہو جیسا سیدھا پڑھنے پر پڑھا جائے۔ (۱۲) ایک لفظ سے دوسرے لفظ کو نکالنے کو اشتقاق کہتے ہیں۔ صنعت اشتقاق میں ایک لفظ سے دوسرا لفظ نکالا جاتا ہے۔ (۱۳) راد، قدرت اللہ، مرزا، مطالع المحامد، ص ا۔ (۱۴) ایضاً، ص ۲۔ (۱۵) ایضاً، ص ا۔ (۱۶) ایضاً، ص ۱۲۔ (۱۷) ایضاً، ص ۲۷۔ (۱۸) ایضاً، ص ۹۴۔ (۱۹) ایضاً، ص ۱۱۰۔ (۲۰) اختر، واجد علی شاہ، ہیبت حیدری، کلکتہ، مطبع سلطانی، ۱۲۲۹ھ، ص ۲۶۹۔ (۲۱) راد، قدرت اللہ، مرزا، مطالع المحامد، ص ۴۳۔ (۲۲) ایضاً، ص ۱۷۱۔ (۲۳) ایضاً، ص ۳۴۔ (۲۴) ایضاً، ص ۱۵۲۔ (۲۵) ایضاً، ص ۱۳۸۔ (۲۶) ایضاً، ص ۱۴۰۔ (۲۷) ناسخ، امام بخش، مولد شریف، لکھنو، مطبع نامی، ۱۲۸۳ھ، ص ۱۴۔ (۲۸) امانت علی، شیخ، تذکرہ رسول اکبر، لکھنو، مطبع نول کشور، ۱۸۷۷ء، ص ۲۲۔ (۲۹) راد، قدرت اللہ، مرزا، مطالع المحامد، ص ۱۷۹۔ (۳۰) ایضاً، ص ۱۱۲۔ (۳۱) ایضاً، ص ۲۰۹۔ (۳۲) ایضاً، ص ۲۱۳۔ (۳۳) ایضاً، ص ۲۱۴۔ (۳۴) ایضاً، ص ۱۵۰ (حاشیہ کتاب)۔ (۳۵) ایضاً، ۲۱۸۔ (۳۶) ایضاً، ص ۳۲۔ (۳۷) ایضاً، ص ۲۵۔ (۳۸) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: ابن ہشام، ج ا، ص ۱۰۸۔ طبری، ج ۲، ص ۶۰۶۔ (۳۹) تفصیل ملاحظہ ہو: شبلی نعمانی، سیرۃ النبی، ج ا، ص ۱۱۵۔ (۴۰) راد، قدرت اللہ، مرزا، مطالع المحامد، ص ۳۶۔ کسریٰ کے محل میں زلزلہ آنے کی روایت دلائل النبوۃ، ج ا، ص ۴۰، مواہب اللدنیہ، ج ا، ص ۴۴ اور تاریخ طبری ج ۲، ص ۱۶۶ میں ذکر ہوئی ہیں اور پھر انہی کے توسط سے بعد کی کتب میں ذکر ہوتی چلی گئیں۔ (۴۱) عسقلانی، ابن حجر، الاصابہ فی تمییز الصحابہ، بیروت، دارالکتب، ج ۳، ص ۵۹۷۔ (۴۲) سلیمان ندوی، سیرۃ النبی، ج ۳، ص ۴۰۹۔ (۴۳) راد، قدرت اللہ، مرزا، مطالع المحامد، ص ۵۰۔

مولانا عبدالسلام ندوی کی شاعری

ڈاکٹر عمیر منظر

مولانا عبدالسلام ندوی کو عام طور پر علوم اسلامیہ کے مایہ ناز اسکالر کے طور پر جانا جاتا ہے۔شبلی اکیڈمی کے وہ وابستگان جو عالمی سطح پر شہرت اور شناخت رکھتے ہیں اور تاریخ وسیرت سے متعلق جن کے قلمی کارنامے اہم سمجھے جاتے ہیں ان میں مولانا عبدالسلام ندوی کا نام شامل ہے۔اسی کے ساتھ ساتھ ''شعرالہند'' اور ''اقبال کامل'' جیسی بلند پایہ ادبی وتنقیدی تصانیف ان کی یادگار ہیں۔آزاد ہندستان میں اقبال شناسی کی ابتدا ''اقبال کامل'' سے ہوتی ہے جبکہ شعرالہند سے اردو ادب میں دبستانوں کے حوالے سے مطالعات کی بنیاد پڑی۔یہ الگ بات ہے کہ دبستانوں کا یہ تصور شعری رسومیات میں کسی بنیادی تبدیلی کی نشاندہی نہیں کرتا۔ان کتابوں اور متعدد ادبی مقالات سے مولانا کی ادب شناسی اور شعرفہمی کا ادراک کیا جاسکتا ہے لیکن بحیثیت شاعران کا ذکر نہیں کیا گیا۔اس کی وجہ شاید یہ رہی ہے کہ مولانا نے شاعری پر بہت زیادہ توجہ نہیں دی اور نہ اس کے لیے کوئی خاص اہتمام ہی کیا۔ہاں ان کے قریبی احباب اور متعلقین مولانا کی شعری سرگرمیوں سے ہمیشہ باخبر رہے۔

مولانا کو جو ماحول ملا تھا وہ شعری سرگرمیوں سے عبارت تھا۔لکھنؤ کی ادبی وشعری روایات کا قدرے روشن زمانہ ان کے حصہ میں آیا،جس سے انھوں نے خاطرخواہ استفادہ کیا نیز شعرالہند کی تصنیف نے ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو مزید جلا بخشی۔

مولانا عبدالسلام ندوی علامہ شبلی نعمانی کے خاص تربیت یافتہ تھے۔علامہ کی وفات کے بعد وہ آستانہ شبلی سے اس طرح وابستہ ہوئے کہ کسی اور طرف نگاہ بھی نہیں کی۔الہلال سے وابستگی

شعبۂ اردو،مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی،لکھنؤ کیمپس۔

نے ان کے جمالیاتی اور ادبی ذوق کو مزید جلا بخشی۔علامہ شبلی کے شعری کمالات سے دنیا واقف ہےاور مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں حسرت موہانی کا یہ شعر تو زبان زد خاص وعام ہے۔

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر
نظم حسرت میں کچھ مزا نہ رہا

مولانا عبدالسلام ندوی کی شعری و ادبی صلاحیتوں کے ارتقاء میں دیگر عوامل کے ساتھ علامہ شبلی نعمانی اور مولانا آزاد کی تربیت اور صحبت کو خاص دخل ہے۔

یہ سچ ہے کہ مولانا کے علمی کمالات کے سامنے ان کی شاعری کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ مولانا کی شاعری روایتی رنگ وآہنگ سے عبارت ہے اس میں شعری حسن اور بیان کی رنگارنگی کی وہ فراوانی نہیں ہے جو ان کی نثر کا حصہ ہے۔

غزل کے روایتی شعرا کے یہاں محبوب کے حسن وجمال اور عاشق کی محرومیوں کے ساتھ ساتھ زاہد، واعظ اور شیخ پر طنز کرنا ایک عام بات ہے۔غزل میں اس نوع کے مضامین کی کمی نہیں ہے۔مولانا کے یہاں بھی یہ مضامین کثرت سے ملتے ہیں۔اس نوع کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

کڑی ہے دھوپ محشر کی ٹھہرا اے واعظ ناداں ہمارے ساتھ زیر سایۂ دامان ترجانا
قابل قدر ہے زاہد یہ تری ریش سفید زیب دیتا ہے اسے پُنبۂ مینا کہیے
توڑے سبو کو خاک کہ اب محتسب کو بھی خود لطف آرہا ہے شکست خمار میں
نشہ آتا ہے تو پھر وعظ بھی کہہ لیتے ہیں پی کے ہم اور بھی ہشیار ہوئے جاتے ہیں
ذرا تو ہاتھ تو رکھ دے کسی کے روئے روشن پر مرا ذمہ جو اے زاہد ید بیضا نہ ہوجائے
یہ مے آج دم کرکے واعظ نے دی ہے حرام اس کو سمجھیں نہ میخانے والے
کسے خبر ہے در پردہ نیت زاہد شریک صحبت رندان بادہ خوار میں ہے

غزل میں زاہد وواعظ سے متعلق جو مضامین باندھے جاتے ہیں ان میں شراب اور اس کے متعلقات کا ذکر اکثر کیا جاتا ہے۔مولانا کے ایک معاصر شاعر خواجہ عزیز الحسن مجذوب لکھنوی کا ایک شعر ہے:

شیخ پینے کا ارادہ تو کرے حوض کوثر سے منگا لی جائے گی

عبدالسلام ندوی کے ان اشعار کے مطالعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اسی روایت کو نبھانے کی سعی کی ہے۔ پہلے شعر میں دامان تر کا اشارہ کسی تشریح کا محتاج نہیں۔ دوسرے شعر میں پنبۂ مینا اور ریش سفید کا طنز بے حد بلیغ ہے۔ تیسرے شعر میں محتسب کو شکست خمار میں لطف آرہا ہے۔ پی کے ہوشیار ہونے کا لطف بھی خوب ہے۔ معمولی میکش سے یہ امید نہیں کی جاسکتی ہے۔ پانچویں شعر کا مضمون عام طور پر شاعری میں کم باندھا گیا ہے۔ باوجود اس کے کہ اس شعر میں لفظوں کی بندش بہت چست نہیں ہے پھر بھی روئے روشن پر زاہد کے ہاتھ رکھنے میں لطف کا ایک خاص پہلو نظر آتا ہے۔ چھٹا شعر تضاد شعر و شریعت کا بلیغ اشاریہ ہے۔ چونکہ واعظ نے مے دم کر کے دی ہے اس لیے اب اس کو میخانے والے حرام نہ سمجھیں۔ اس طرح کے اشعار سے دبستان لکھنؤ کی ظاہری کشش کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ آخری شعر میں کسے خبر ہے کا ٹکڑا بہت بلیغ ہے۔ یہ اردو شاعری کے مسلمات میں سے ہے کہ زاہد کا عمل اور نیت ایک دوسرے سے متضاد ہوتے ہیں۔ بظاہر زاہد کا عمل تو کچھ اور ہوتا ہے مگر یہ کسے معلوم کہ زاہد کی نیت رندان بادہ خوار کے ساتھ ملی ہوئی ہے۔ زاہد پر بہت سخت چوٹ ہے۔ اس نوع کے اشعار سے اردو شاعری کا دامن مالا مال ہے۔ قمر جلالوی کا شعر ہے:

قمر تسبیح پڑھتے جارہے ہیں سوئے میخانہ کوئی دیکھے تو یہ سمجھے بڑے اللہ والے ہیں

کبیر احمد جائسی نے اس شعر کا پہلا مصرعہ یوں لکھا ہے ''کسے خبر ہے در پردہ نیت زاہد'' جو کہ غلط ہے کیونکہ در پردہ کی ترکیب بے معنی ہے اس لیے میرے خیال میں درست متن کی صورت یہ ہوگی ''کسے خبر ہے کہ در پردہ نیت زاہد''۔

مولانا کی شاعری روایت کے گہرے شعور سے عبارت ہے۔ اس وقت شاعری کے جو رجحانات تھے ان کی عکاسی مولانا کے کلام میں موجود ہے۔ زاہد و واعظ، ساغر و پیمانہ، عشق و محبت اور دشت و صحرا وغیرہ سے اردو شاعری کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ ان مضامین کو شاعری میں ادا کیے بغیر خود کو شاعر تسلیم کروانا دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ اس تناظر میں جب عبدالسلام ندوی کی شاعری کا مطالعہ کیا جاتا ہے اس کی متعدد جہتیں سامنے آتی ہیں۔

چلو جنت میں شغل ساغر و پیمانہ ہوجائے جگہ پرلطف ہے اک صحبت رندانہ ہوجائے

مستی میں کھینچ لیتے ہیں رندان مے پرست دامن پکڑ کے رحمت پروردگار کا
سامان کیا زیارت صحرا کے واسطے چادر لپیٹ لی کبھی عریاں نکل گیا
اے چشم شوق جلوہ محبوب کے سوا کیا کیا نہ دیکھنا ہے تجھے انتظار میں
زبان بے زبانی ہم سے بڑھ کر کون سمجھے گا تری تصویر سے فرقت میں کی ہے گفتگو برسوں

اگر یہ بات درست ہے کہ شعر سے کسی کے فکری رویے اور رجحان کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا تو یہ بات مولانا عبدالسلام ندوی پر بھی صادق آتی ہے۔ درج بالا پہلا شعر اس کا ثبوت ہے۔ اس شعر میں جنت کو پر لطف جگہ کہا گیا ہے اور وہاں پر اک صحبت رندانہ کی آرزو ہے۔ فکر و خیال کی جس وادی سے شعرا کا بالعموم رابطہ رہتا ہے اس کے پیش نظر کیا اس کے امکان سے انکار کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے شعر میں رندان مے پرست کا عمل قابل توجہ ہے۔ عاشق اور صحرا ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں تیسرا شعر اس کا خوبصورت اظہار ہے، عاشق کے لیے صحرا جانا دراصل ایک کار ثواب ہے اور اسی لیے زیارت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ پہلے مصرعے میں استفہام برائے نفی ہے یعنی سامان کی ضرورت ہی نہیں۔ دوسرا مصرعہ عاشق کی بے فکری کا غماز ہے۔ کہنا تو یہی ہے کہ صحرا جانے کے لیے کسی اہتمام کی ضرورت نہیں، بلکہ جو جی میں آیا پہن لیا۔ اصل چیز تو صحرا کی زیارت ہے۔ اس سے عاشق کی کیفیت اور اس کے جنوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ چوتھا شعر انتظار کی کیفیت سے عبارت ہے۔ انتظار میں جلوہ محبوب کے سوا تجھے کیا کیا نہیں دیکھنا ہے۔ آخری شعر سادہ بیانی کی خوبصورت مثال ہے۔ زبان بے زبانی کو سمجھنے کے دعوی کی مثال فرقت کے لمحوں میں تصویر سے گفتگو کرنا ہے۔ اس طرح کے بہت سے پہلو مولانا کی شاعری میں نظر آتے ہیں۔ مولانا کے بعض اشعار نہایت برجستہ اور پیکر تراشی کے عناصر سے بھرپور ہیں۔ مثلاً:

تیغ کی ان کو پئے قتل ضرورت کیا ہے خود ہی کھنچ کھنچ کے وہ تلوار ہوئے جاتے ہیں

محبوب تو قاتل ہوتا ہی ہے لیکن یہ کہنا کہ وہ کھنچ کھنچ کے خود ہی تلوار ہو گیا ہے اور اس لیے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ قتل کے لیے محبوب کو تیغ کی ضرورت نہیں ہے قابل تعریف ہے۔ اسی غزل کا ایک اور شعر ہے:

مست آنکھوں کے اشارے مجھے دیتے ہیں یہ طنز بے پئے آپ تو سرشار ہوئے جاتے ہیں

طنز دینا اردو کا روز مرہ نہیں ہے بلکہ اس کو خلاف محاورہ کہا جائے گا البتہ بے پئے سرشار ہونے کا جواب نہیں۔ اسی طرح لفظ غیر کا استعمال دیکھیں:

تیرے پہلو میں تو بیٹھے ہیں مگر غیر کے ساتھ ہو کے آسان وہ دشوار ہوئے جاتے ہیں

مولانا کے مختصر کلام کے مطالعہ سے ان کے فنی التزامات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ نظر، نگاہ اور اس سے متعلق دیگر تلازموں سے انھوں نے شاعری کی جو دنیا خلق کی ہے اس سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ اس نوع کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

غیر کی نظروں کا پرتو کیا نظر آیا انہیں کیوں جھجکتی ہیں نگاہیں روزن در دیکھ کر

بدگمانی سے انہیں میری نظر وہ سمجھے چمکے ذرے بھی اگر روزن دیوار کے پاس

بعض اشعار میں حقیقت ومجاز دونوں کا لطف ہے:

جہاں دیکھتے ہیں جدھر دیکھتے ہیں فقط اک فریب نظر دیکھتے ہیں

اشارہ جو پائیں تو تم کو بھی دیکھیں ابھی تو تمہاری نظر دیکھتے ہیں

انہیں دیکھنے کی کہاں راہ نکلی ابھی تک تو دیوار و در دیکھتے ہیں

مولانا کا ایک شعر ہے۔

ہمیشہ کوچۂ جاناں کی خاک اڑاؤں گا مرا نوشتہ قسمت خط غبار میں ہے

نوشتہ قسمت کے خط غبار میں ہونے کی وجہ سے ہی عاشق کوچہ جاناں کی خاک اُڑا رہا ہے۔ شعر میں خاک اُڑانا اور خط غبار میں جو رشتہ قائم کیا گیا ہے وہ لاجواب ہے۔ لغات میں ''خط غبار'' کے معنی ہیں ''فن خطاطی میں آرایشی خط'' (روشن تحریر) کی ایک قسم جس میں عبارت کو اس طرح لکھا جاتا ہے کہ غبار کی شکل نظر آئے۔

ان فنی جہات کے علاوہ عبدالسلام ندوی نے یوسف وزلیخا، ید بیضا، جام جم، منصور اور دم عیسیٰ کی تلمیحات کا استعمال بھی خوب کیا ہے۔

یوسف کو سستے دام زلیخا نے لے لیا تقدیر تھی کہ حسن کی قیمت ٹھہر گئی

مثل منصور جنہیں حق نے کیا ہے حق گو اور بے باک سر دار ہوئے جاتے ہیں

ان تلمیحات کے علاوہ قفس وآشیاں، بہار وخزاں، گل وبلبل، ساغر گل، عقد ثریا، حریم دل

اور فقیر بے نوا جیسے شعری مرکبات مولانا کی شاعری میں خلق کیے گئے ہیں۔ البتہ یہ شعری مرکبات بہت زیادہ پر قوت نہیں بلکہ عام طور پر یہ وہ مرکبات ہیں جو دیگر شعرا کے یہاں بھی ملتے ہیں اس میں مولانا کا ایسا کوئی امتیاز نہیں جسے ان سے منسوب کیا جا سکے۔ لیکن اس اعتراف کے بغیر چارہ بھی نہیں کہ انہیں شعری اظہار پر قدرت اور اس کے فنی اور فکری ابعاد پر دسترس حاصل تھی۔ غالباً اسی وجہ سے ان کے اشعار عام فہم ہوتے ہیں اور ان کا اسلوب سادہ بیانی کا مظہر ہوتا ہے۔

مولانا کے شعری کمالات پر کم توجہ دی گئی، جن لوگوں نے ان کی شاعری کے بارے میں لکھا ہے انہوں نے بھی براہ راست شاعری پر کچھ لکھنے کے بجائے شاعری سے متعلق دیگر باتوں کو بیان کیا ہے۔ یعنی یہ کہ مولانا کا زمانہ کیا تھا، کن ادیبوں اور شاعروں سے ربط و تعلق تھا اور کن لوگوں نے مولانا کی شاعری کو پسند کیا ہے۔ معاصر شعرا سے تعلقات کی نوعیت اور ''معارف'' کے علاوہ کن رسالوں میں ان کا کلام شائع ہوا۔ یہ باتیں مولانا کی ادبی و شعری سرگرمیوں سے ضرور باخبر کرتی ہیں مگر اس سے ان کی تخلیقی ہنرمندی کا کوئی گوشہ روشن نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر گلشن طارق پاکستان کی معروف اسکالر ہیں ان کی ضخیم کتاب ''عبدالسلام ندوی کی ادبی خدمات'' (تنقید کے حوالے سے) ہے اس میں شاعری کا ایک مختصر سا باب انھوں نے قائم کیا ہے۔ لیکن مولانا کے اشعار پر خود کچھ لکھنے کے بجائے ان کی شعری سرگرمیوں اور دیگر کوائف کو پیش کیا ہے۔ انھوں نے مولانا کی شاعری کے سلسلے میں ارشد کیانی کی رائے نقل کی ہے۔ ارشد کیانی نے ۱۹۶۳ء میں پنجاب یونیورسٹی، لاہور میں ایم۔ اے کے دوران مولانا عبدالسلام ندوی کی شاعری پر مقالہ تحریر کیا تھا۔ ارشد کیانی کے مقالہ سے جو اقتباس گلشن طارق نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ارشد کیانی شاعری خصوصاً غزل کے فنی رموز سے خاطر خواہ واقفیت نہیں رکھتے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''ان کی غزلوں میں تغزل کے ساتھ ساتھ ایک مرکزی موڑ ملتا ہے جو غزل کے ہر شعر کو وحدت تاثر کے رشتے سے باندھ دیتا ہے۔ غنائیت اور نغمگی کا رکھ رکھاؤ بھی ان کے ہاں ایک حد تک موجود ہے۔ ایمائیت، اشاریت اور تلمیحات کا استعمال ان کی غزلوں میں عام ملتا ہے''۔ (بحوالہ عبدالسلام ندوی کی

ادبی خدمات، ڈاکٹر گلشن طارق ص:۱۰۹۔ ۱۱۰)

ڈاکٹر گلشن طارق نے مولانا کی شاعری کا سرسری مطالعہ کیا ہے۔انہوں نے مولانا کی تقریباً دس غزلیں نقل کردی ہیں۔ان غزلوں پر انہوں نے کوئی رائے نہیں دی ہے البتہ اس سے یہ آسانی ضرور پیدا ہوئی ہے کہ قاری خود مولانا کی شاعری کے بارے میں کوئی رائے قائم کرلے۔

ہندستان میں مولانا عبدالسلام ندوی کی شخصیت ،سوانح اور علمی و ادبی خدمات پر خاصا وقیع کام کیا گیا ہے۔ پروفیسر کبیر احمد جائسی نے متعدد مضامین کے علاوہ ساہتیہ اکیڈمی کی فرمائش پر ایک مونوگراف بھی تحریر کیا۔ ۲۰۱۳ء میں مولانا عبدالسلام ندوی فاونڈیشن نے کبیر احمد جائسی کی کتاب ''مولانا عبدالسلام ندوی ایک مطالعہ'' شائع کیا۔ یہ کتاب پاکستان سے بھی شائع ہوئی ہے۔ پروفیسر جائسی مرحوم نے مونوگراف کے ہی موضوعات کو اس کتاب میں کسی تفصیل سے لکھا ہے۔اس سے قبل دسمبر ۱۹۶۵ء میں ان کا ایک مضمون ''مولانا عبدالسلام ندوی اور ان کی شاعری'' کے عنوان سے ماہنامہ آج کل میں شائع ہوا تھا۔ اس کے علاوہ پروفیسر کبیر احمد جائسی نے مولانا کی ادبی خدمات سے متعلق متعدد مضامین لکھے لیکن اس کے باوجود عبدالسلام ندوی کی شاعری سے متعلق مطالعہ و تحقیق کا حق ابھی ادا نہیں کیا جاسکا ہے، جائسی صاحب نے اپنے کسی بھی مضمون میں مولانا کی شاعری کا براہ راست مطالعہ نہیں کیا ہے۔ کتاب میں شاعری کا جو باب قائم کیا ہے اس سے سوانحی گوشے ہی مرتب کیے جاسکتے ہیں۔مثلاً مولانا عبدالسلام ندوی جلال لکھنوی کے معتقد تھے۔ غالباً اسی سبب سے ان کو ''لکھنوی شاعر خیال کیا جاتا'' ہے۔ جائسی صاحب نے لکھا ہے کہ ''وہ نہ دلی کے شاعر تھے اور نہ لکھنؤ کے غزل گو۔ وہ پاکیزہ، متین اور سنجیدہ شعر کہتے تھے''۔ (ص:۴۲)
انہوں نے یہ بھی لکھا کہ:

> ''مولانا نے آگرہ میں مشاعرہ پڑھا..... جلال لکھنوی سے تلمذ قائم کرنا چاہا۔ان کی خدمت میں ایک غزل بہ غرض اصلاح ضرور بھیجی تھی لیکن جلال بغیر مالی منفعت کے کسی کے کلام پر اصلاح نہیں دیتے تھے...... مولانا نے امیر مینائی کو بھی چند غزلیں دکھائی تھیں جو سب کی سب ''دامن گلچین'' میں شائع ہوئیں یہ رسالہ امیر مینائی کی سرپرستی میں شائع ہوتا تھا اور اس زمانے کا بڑا مقبول رسالہ

تھا''۔(مولانا عبدالسلام ندوی ایک مطالعہ، پروفیسر کبیر احمد جائسی ص:۳۹)

جائسی صاحب کی اس رائے سے پوری طرح اتفاق نہیں کیا جاسکتا کہ مولانا عبدالسلام ندوی پاکیزہ، متین اور سنجیدہ شعر کہتے تھے۔حقیقت یہ ہے کہ شاعری کے باب میں مولانا صرف شاعر تھے۔ان کی شاعری میں وہ تمام مضامین موجود ہیں جو عام طور پر ہماری شاعری کا اہم حصہ ہیں یا جن سے عام طور پر غزل کی شناخت ہوتی ہے۔ان کے کلام کے مطالعہ سے عیاں ہوتا ہے کہ انہوں نے اس وادی خیال کی خوب سیر کی ہے اور اس کا بھرپور لطف اٹھایا ہے۔مولانا کے یہ اشعار ان کے اسی رویے کے غماز ہیں۔

چلو جنت میں شغل ساغر و پیمانہ ہوجائے　　جگہ پرلطف ہے اک صحبت رندانہ ہوجائے

مستی میں کھینچ لیتے ہیں رندان مے پرست　　دامن پکڑ کے رحمت پروردگار کا

چھپے چوری جو کچھ کرتا ہے زاہد　　کھلا راز اس کا اک پردہ نشیں سے

اسی تناظر میں ''رقص شرر'' میں پروفیسر ملک زادہ منظور احمد کا یہ بیان بھی ملاحظہ فرمالیں:
وہ قابل قدر مصنف ہونے کے علاوہ ایک اچھے اور خوش فکر شاعر بھی تھے۔ان کی شاعری تو منظر عام پر نہیں آئی مگر طرح پر لگایا ہوا ایک مصرعہ مجھے یاد رہ گیا۔ایک دن گفتگو میں فرمایا کہ طرح یہ تھی

مجھ سے دیکھا نہ گیا حسن کا رسوا ہونا

اس طرح میں مولانا نے اپنی غزل ہم سب کو سنائی اور تو کوئی شعر یاد نہیں ہے مگر جو گرہ لگائی تھی وہ لطف دے گئی۔

میں نے جنت ہی کو چھوڑا جو ملی شیخ کو حور　　مجھ سے دیکھا نہ گیا حسن کا رسوا ہونا

(رقص شرر، ملک زادہ منظور احمد ص:۱۰۷)

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جائسی صاحب نے پاکیزہ، متین اور سنجیدہ شعر کہنے والی جو بات لکھی ہے وہ پوری طرح درست نہیں ہے۔

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کی کتاب ''یگانہ روزگار مولانا عبدالسلام ندوی'' اس لحاظ سے بہتر ہے کہ اس میں شاعری کا تجزیہ قدرے بہتر ہے۔البتہ ان کا یہ لکھنا کہ ''پاکیزہ عشق و محبت، واردات قلبی، ہجر و فراق، شیفتگی و وارفتگی ان کی شاعری کے موضوعات ہیں محل نظر ہے''۔(یگانہ روزگار۔

مولانا عبدالسلام ندوی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی ص : ۱۲۳۔ ۱۲۴) لیکن الیاس الاعظمی کا یہ تجزیہ درست ہے کہ:

> ’’مولانا قدیم طرز سخن کے دلدادہ تھے، موضوع، مواد، ہیئت، ترکیب، ردیف، قافیہ غرض قدیم سانچوں کو وہ پسند کرتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے انہیں قدیم اصولوں کو اپنی غزلوں میں برتنے کی کوشش کی۔ (ایضاً ص:۱۲۶)

ان معروضات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مولانا غزل کے روایتی شعرا میں شامل ہیں۔ اگر انہیں تصنیف و تالیف سے فرصت ملی ہوتی اور شاعری کی طرف متوجہ ہونے کا مزید موقع ملا ہوتا تو شاعری کو بہت کچھ عطا کرتے۔

کتابیات:

رقص شرر، ملک زادہ منظور احمد، سیمانت نگر۔ کنچن بہاری مارگ، لکھنؤ ۲۰۰۴ء۔

عبدالسلام ندوی کی ادبی خدمات (تنقید کے حوالے سے)، ڈاکٹر گلشن طارق، مولانا عبدالسلام ندوی فاؤنڈیشن، ممبئی ۲۰۱۴ء۔

مولانا عبدالسلام ندوی ایک مطالعہ، پروفیسر کبیر احمد جائسی، مولانا عبدالسلام ندوی فاؤنڈیشن۔ ممبئی ۲۰۱۳ء۔

یگانہ روزگار مولانا عبدالسلام ندوی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ، اعظم گڑھ ۲۰۱۴ء۔

کتب خانہ محمدیہ اور ممبئی کی منتشر یادیں

جناب عبدالمتین منیری

جامع مسجد ممبئی کے جواں سال مفتی محمد اشفاق صاحب نے اطلاع دی ہے کہ جامع مسجد کے ماتحت جاری کتب خانہ محمدیہ ایک طویل عرصہ بعد نئے حوصلے اور آن بان کے ساتھ دوبارہ کھل رہا ہے۔ یہ فرمائش بھی کی کہ کتب خانہ کے تعلق سے کچھ یادوں کو تازہ کروں۔ اپنی یہ بساط کہاں لیکن ایسی خوش آیند خبر اور واقعہ پر واقعی کچھ کہانیاں یاد سی آ کے رہ گئیں۔

۱۹۷۴ء میں جب تعلیم کے روایتی سلسلے سے فراغت ہوئی تو تایا محترم محی الدین منیری صاحب نے عیدالفطر کے بعد ہمیں یہ کہہ کر ممبئی بھیج دیا کہ کچھ وقت مسجد اسٹریٹ میں واقع ان کی کتابوں کی دکان ایجنسی تاج کمپنی میں دوں اور زیادہ تر وقت عربی زبان کی صلاحیت درست کرنے کے لیے ممبئی کے کتب خانوں کی سیر کروں۔ اس سلسلے میں وہ اپنے وسائل کو استعمال کرتے ہوئے پہلے انڈو عرب سوسائٹی لے گئے جہاں محدود تعداد میں عربی پرچے آتے تھے، کچھ دنوں نجمہ ھبت اللہ صاحبہ یہاں پر سکریٹری کی حیثیت سے ملی تھیں۔ پھر چرچ گیٹ میں واقع کویتی قنصل خانے کے ماتحت ثقافتی سنٹر لے گئے، جہاں پر عالم عرب کے ہر علاقے سے اخبارات اور پرچے آتے تھے اور کثیر تعداد میں عرب طلبہ اور ممبئی آنے والے عرب حضرات مغرب بعد آتے تھے، اس وقت سلیمان نامی قنصل خانے کے ثقافتی اتاشی اس کے انچارج اور ہم پر بڑے مہربان تھے، بعد میں یہیں سے عربی اخبارات اور پرچوں کے پتے لے لے کر ہم نے کتب خانہ جامعہ اسلامیہ بھٹکل کے نام پر متعدد اخبارات و رسائل جیسے الاتحاد ابوظبی، القبس کویت، عمان مسقط جاری کروائے تھے، کچھ طلبہ کے نام ماہانہ الوعی الاسلامی کویت اور التربیۃ الاسلامیہ بغداد بھی جاری ہوا تھا، جنہیں طلبہ بڑے شوق سے

بھٹکل۔

دیکھتے تھے۔اس کے بعد منیری صاحب توجہ سے وابستہ سرگرمیوں میں مصروف ہو گئے اور ان کی حج سے واپسی کی فرصت میں ممبئی کے علمی مراکز میں گھومنے پھرنے اور یہاں کی علمی وادبی سرگرمیوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ہمیں مل گیا، اس دوران محرم الحرام اور ربیع الاول کے مہینے بھی آ گئے جو ممبئی کے مسلمانوں کے لیے اس دور میں بڑی اہمیت رکھتے تھے۔

انہی دنوں کامبیکر اسٹریٹ میں اسلامی ہند کے عظیم مورخ مولانا قاضی اطہر مبارکپوریؒ کی رہائش گاہ مرکز علمی بھی جانا آنا شروع ہوا۔قاضی صاحب اس زمانے میں انجمن اسلام ہائی اسکول میں دینیات پڑھاتے تھے اور احوال و معارف کے عنوان سے روزنامہ انقلاب میں روزانہ کالم لکھا کرتے تھے، وہ ماہنامہ البلاغ میں ہمارے تایا کے شریک مدیر اور جمعیت علمائے ہند مہاراشٹر کے صدر بھی تھے۔مرکز علمی کیا تھا ایک کمرہ، جس کے ایک کونے پر کھٹیا رکھی ہوئی تھی، دوسری طرف دو ایک کتابوں کی الماریاں اور دو ایک چٹائیاں جن پر دری بچھی ہوئی تھی، قاضی صاحب کی یہی کچھ کائنات تھی لیکن ان کے علمی مرتبہ اور مقام کی وجہ سے یہاں ان سے ملنے بڑے بڑے اہل علم روز آیا کرتے تھے۔

قاضی صاحب کے مرکز علمی سے چند قدم پر ممبئی کی قدیم تاریخی جامع مسجد تھی، یہ مسجد ایک تالاب پر کھمبوں پر اس طرح قائم کی گئی تھی کہ تالاب میں وضو کرنے والے کا چہرہ قبلہ کی طرف ہو۔ اس مسجد کی تعمیر کا آغاز ۱۷۷۵ء میں قصاب برادری کے چند لوگوں نے کیا تھا، لیکن پھر مالی پریشانی کی وجہ سے تعمیر میں تاخیر ہوئی اور اس کی تکمیل کوکنی برادری کے ایک تاجر ناخدا محمد علی روگھے کے ہاتھوں ۱۸۰۸ء میں ہوئی۔

مسجد کے مرکزی دروازے کے دائیں جانب ایک ہال تھا جس میں مسجد انتظامیہ کے ماتحت مکتبہ محمدیہ قائم تھا، دروازے میں داخل ہوتے ہی سامنے ایک چوکور فریم میں حضور اکرم ﷺ کی طرف منسوب رومال نظر آتا، جو ہم جیسوں کے لیے لائق دید ہی نہیں نظر افروز بھی ہوتا۔

ہال میں ایک بڑی میز تھی اور اس سے کچھ ہٹ کر ایک چھوٹی سی میز تھی، جس کے پاس کرسی پر ایک دھان پان دبلے پتلے بزرگ بیٹھے نظر آتے، دیکھنے میں بالکل سیدھے سادھے، چہرے پر مختصر سی خشخشی ڈاڑھی، لیکن شخصیت میں بڑی اپنائیت تھی، جب مہاراشٹر حکومت کا سکریٹریٹ اپنی

نئی جگہ منتقل نہیں ہوا تھا تو یہ حضرت پورٹ بندر پر واقع سرکاری دفتر میں ملازم تھے، سنا ہے اس زمانے میں بڑے خوش پوشاک ہوا کرتے تھے،لیکن اب ریٹائرڈ ہوکرمکمل اسی کتب خانے کے لیے وقف ہو گئے تھے، یہ تھے مخارج قرآن کے ماہر اور استاد قاری اسماعیل کاپرے۔

سنا ہے انہیں جوانی میں ٹی بی کا عارضہ ہوگیا تھا، اس زمانے میں یہ بڑا مہلک اور متعدی مرض شمار ہوتا تھا،لوگ مریض کے قریب آتے ہوئے خوف کھاتے تھے،لیکن جب انہوں نے خود کوقرآن سکھانے کے لیے وقف کردیا تو اللہ نے اس کی برکت سے اس بیماری سے آپ کوشفا بخشی۔ ان کے ایک شاگرد تھے نام تھا ان کا قاسم ، وہ دوران درس احتراماً ان کا جھوٹا پانی ہنسی خوشی پیتے تھے، بعد میں انہوں نے کاتب قرآن کی حیثیت سے نام کمایا، انہیں دوبار حضور اکرم ﷺ کی زیارت خواب میں نصیب ہوئی تھی ، وہ کہتے تھے کہ یہ سب اپنے شیخ کے احترام و پاسداری کی برکت ہے۔قاری صاحب کے پاس بڑے بوڑھے تجوید سیکھنے کے لیے آتے تھے، ان میں بھٹکل کے نواب ایاز مسجد کے بزرگ امام عبدالرزاق خجندی اور ڈاکٹر سید محمد قاسم پیرزادے مرحوم قابل ذکر ہیں۔

ممبئی میں جن علماء واکابر نے اصلاحی کام کیے اور اپنی مجالس سے یہاں کی فضاؤں کو معطر کیا ان میں ایک اہم نام مولانا قاری ودود الحیٔ نفیس لکھنویؒ کا ہے، ایسے قاری اور جامع الصفات خطیب روز روز پیدا نہیں ہوتے ،آواز میں اللہ نے بلا کا سوز اور حسن دیا تھا، تلاوت کرتے تو ایسا لگتا کہ جیسے قرآن کا نزول ہورہا ہے، ادبی وشعری ذوق بھی خوب تھا، افسوس کہ ممبئی کی فضاؤں میں ان کی تقریریں بکھر کر رہ گئیں، کہیں ان کی ریکارڈنگ ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔ ان کی آواز میں تلاوت کے گراموفون کے ریکارڈ ایک کمپنی نے بنائے تھے، اب وہ بھی نایاب ہیں ۔یہی قاری ودود الحیٔ صاحب فرمایا کرتے تھے کہ قاری کاپرے جس مجلس میں ہوں وہاں تلاوت کرتے ڈر لگتا ہے کہ کسی مخرج کی غلطی کو پکڑ نہ لیں۔لیکن قاری کاپرے جامع مسجد کے بزرگ امام مولانا غلام محمد خطیب کے گرویدہ اوران کے تلفظ و انداز تلاوت پر فدا تھے۔

قاری کاپرے کو بھٹکل والوں سے انس تھا، یہاں کی جن شخصیات کا وہ بہت احترام کرتے تھے ان میں سے ایک مولانا محمود خیال صاحب تھے جن کی شہرت اسی جامع مسجد کے خطیب کی

حیثیت سے ہوئی تھی، وہ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کے شاگردوں میں تھے، انجمن اسلامیہ ہائی اسکول بھٹکل میں پڑھتے پڑھاتے زندگی گزار دی۔ دوسری شخصیت بھٹکل میں متحدہ جماعت المسلمین کے قاضی اور اپنے دور میں فقہ شافعی کے عظیم مرجع مولانا قاضی شریف محی الدین اکرمی مرحوم کی تھی، اکرمی مرحوم نے ایک عرصہ ممبئی کے قاضی عطاء اللہ مرگھے کے نائب کی حیثیت سے گذارا، اپنے علم وتفقہ کی وجہ سے عملاً وہی قاضی شہر تھے، ان کے تفقہ کا ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ جامع مسجد ممبئی کے ایک قدیم خطیب بوڑھے ہوگئے اور بیٹھ کر خطبہ دینے پر مجبور ہوگئے تو ایک فتنہ برپا ہوگیا، ازہر شریف سے بھی فتویٰ لایا گیا جس میں خطیب کو معذور ہونے کی صورت میں بیٹھ کر خطبہ دینے کی اجازت دی گئی تھی، لیکن قاضی اکرمی نے اس کے خلاف یہ کہہ کر دلیل دی کہ یہ اجازت امیر معاویہؓ کے لیے مخصوص تھی، کیونکہ اس وقت امیر معاویہؓ خلیفۃ المسلمین ہونے کی وجہ سے مسلمانوں میں افضل ترین شخص تھے، لیکن یہ خطیب صاحب آج منبر پر چڑھنا چھوڑ دیں تو خطبہ دینے کے لیے دوسروں کی کمی نہیں جو علم وفقہ میں بھی کم نہیں۔ اکرمی صاحب کی رائے کے آگے انتظامیہ نے ہتھیار ڈال دیے۔

اس زمانے میں کتب خانے میں کتابوں کی حفاظت کے لیے بڑی احتیاط برتی جاتی تھی، یہاں کتابیں بھی بڑی نادر ونایاب رکھی ہوئی تھیں۔ اس کا اندازہ ۱۹۲۶ء میں چھپی کتب خانے کی تفصیلی فہرست سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہاں پر رکھی کتابیں کتنی انمول تھیں۔ اس کا اندازہ ہمیں مرکز جمعۃ الماجد للثقافۃ والتراث دبئی میں کام کے دوران محسوس ہوا، جہاں ہمارے ذمے فہرستیں دیکھ کر میکروفلم بنانے کے لیے قیمتی کتابوں کا انتخاب کرنا تھا، اس ناچیز کو علم کے حصول کے لیے زندگی میں کبھی سنجیدگی سے محنت کرنا تو نہیں آیا، لیکن فہرستوں کے مطالعہ نے غیر شعوری طور پر بہت کچھ دیا، یاد پڑتا ہے کہ ہم نے اس وقت میکروفلم کے لیے چھٹی صدی ہجری کے خازن نامی حکیم کی زندگی میں لکھی گئی ایک طبی کتاب کو منتخب کیا تھا، اس ایک نمونے سے قلمی کتابوں کے قدردان کتب خانہ محمدیہ کے علمی ذخیرے کی ندرت اور قدر وقیمت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

فہرست کتب کے تذکرے سے ممبئی میں جالی محلے کے عظیم ناشر کتب محمد غلام رسول سورتی کی پانچ سو صفحات پر محیط فہرست مطبوعات (اسعاف الراغبین) کی یاد تازہ ہوگئی، اسی مکتبہ سے

اکرمی صاحب کی کتاب توضیح المسائل اور تسہیل الفقہ شائع ہوئی تھی، ابھی ہمیں عربی حروف کی تھوڑی شد بد ہوئی تھی، باوجود اس کے نہ جانے کتنی بار اس فہرست کے صفحات پر ہم نے نظر دوڑائی۔ اللہ نے بعد میں علم و کتاب سے ہماری روزی روٹی کو جوڑ دیا اس میں توفیق ایزدی کے ساتھ اس غیر شعوری ورق گردانی سے بھی بڑی مدد ملی۔

اس زمانے میں محمد علی روڈ اور پائیدھونی کے علاقے میں کتابوں کی بہت ساری بڑی چھوٹی دکانیں ہوا کرتی تھیں، علوی بک ڈپو، کتابستان، علی بھائی شرف علی کا تو لوگوں کو اب نام بھی یاد نہیں رہا، شرف الدین کتبی اپنے زمانے میں عربی کتابوں کے بڑے ناشر شمار ہوتے تھے، شام و مصر کے ناشرین کتب کی طرح، ہر اتوار فٹ پاتھ پر کباڑی پرانی کتابوں کا بازار لگاتے تھے، بڑی قیمتی اور نایاب کتابیں یہاں سستے داموں ملا کرتی تھیں، یہیں سے ہم نے زمانہ کانپور کی فائل کوڑیوں کے بھاؤ میں خریدی تھی، ایک روز کباڑی کے یہاں عربی زبان کی ایک بہت ہی قدیم بوسیدہ کتاب ملی، جس کا ابتدائی اور آخری صفحہ غائب تھا، کتاب کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ بڑے کام کی چیز ہوگی، کتاب لے کر ہم قاضی اطہر صاحب کے پاس پہنچے، کتاب دکھائی تو وہ حیران رہ گئے، کہنے لگے، یہ نادر کتاب کہاں سے مل گئی، ہم نے صرف اس کا نام سن رکھا تھا، لیکن اس کے چھپنے کا ہمیں علم نہیں تھا، قاضی صاحب سے کتاب کا نام لے کر ہم قاری کاپرے کے یہاں کتب خانہ محمدیہ پہنچے۔

یہ کتاب ''عنوان الشرف الوافی فی الفقہ والنحو والتاریخ والقوافی'' تھی جو دراصل عربی زبان کا ایک معجزہ ہے۔ کتاب تو دراصل فقہ کی ہے، لیکن تمام سطروں کے ابتدائی حروف کو اوپر سے نیچے جوڑ دیا جائے تو نحو کی، اسی طرح درمیانی حروف کو جوڑا جائے تو تاریخ کی اور آخری حروف کو جوڑا جائے تو قوافی کی کتاب بنتی ہے، ایک کتاب میں پانچ کتابیں، اس طرح کہ عبارتیں تمام آپس میں مربوط و بامعنی۔ یہیں انہوں نے تاریخ ابن خلکان نکال کر دی، اس طرح ہم نے اس کتاب کو ہاتھ سے لکھ کر مکمل کیا اور ابن خلکان سے مصنف کے حالات بھی جمع کر دیے۔

قاری صاحب کو جب ہمارے ذوق کا احساس ہو گیا تو ہم پر بڑے مہربان ہو گئے، قیمتی قیمتی قلمی کتابیں دکھاتے تھے، کتب خانے میں مخدوم علاء الدین علی المہائمیؒ کی قلمی کتابوں کا

وسیع ذخیرہ دیکھنے کو ملا، جن میں تفسیر مہایمی کے کئی ایک نفیس اور مختلف رنگوں کی روشنائی میں لکھے نسخے موجود تھے، مولانا عبدالحئی حسنیؒ کے بقول ہندوستان کی اسلامی تاریخ کی یہ سب سے عظیم اور خواجہ معین الدین اجمیریؒ کے بعد مقبول ترین ساتھ ہی مظلوم ترین شخصیت ہے، تفسیر مہایمی اور فقہ کی ایک مختصر کتاب کے علاوہ ان کی سبھی کتابیں غیر مطبوعہ ہیں، سنا ہے مہایم کی درگاہ کے کتب خانے میں ان کتابوں کا بڑا اثاثہ محفوظ تھا، پتہ نہیں اب ان کا کیا حال ہے۔

قاری صاحب کے پاس ہی ہماری ملاقات حامداللہ ندوی صاحب سے ہوئی، انہی نے ہمیں چرچ گیٹ میں واقع مہاتما گاندھی میموریل اور اس وقت میموریل کے جواں ہمت وجواں سال سکریٹری ڈاکٹر عبدالستار دلوی کا تعارف کرایا۔ حامد اللہ صاحب بڑے نرم خو اور لسانیات کے بڑے عالم تھے، میموریل کے پروجکٹ کے تحت کتب خانہ محمدیہ کی فارسی کی قلمی کتابوں کی فہرست مرتب کرر ہے تھے، اس وقت تک اس فہرست کی ایک جلد زیورطبع سے آراستہ ہوچکی تھی، دوسری پر کام جاری تھا۔ بعد میں انہوں نے ڈاکٹریٹ کر کے بمبئی یونیورسٹی میں لسانیات کے لکچرر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں اور ریٹائرڈ ہونے سے قبل ہی اللہ کو پیارے ہوگئے۔ ندوی مرحوم کے توسط سے مہاتما گاندھی میموریل کی قیمتی اور مرتب لائبریری کے دروازے ہم پر وا ہوئے تھے، یہاں کے ادبی ذخیرے سے ہمیں خوب استفادے کا موقع ملا تھا۔

اب ممبئی کے لوگ ڈاکٹر ذاکر نائیک کو ان کے والد ڈاکٹر عبدالکریم نائیک سے زیادہ جانتے ہیں، ورنہ عبدالکریم صاحب کی سماجی شخصیت ممبئی میں بڑی معروف تھی، اپنی جوانی میں خوب قوم کی خدمت کی، ان ہی کے مالی تعاون سے مولانا عبدالرحمن پرواز اصلاحی مرحوم نے مخدوم مہایمی کی سیرت کا پروجکیٹ مکمل کیا تھا، اس کام کے لیے بھی کاپرے صاحب نے اس زمانے میں کتب خانے سے خوب مدد کی۔

مفتی اشفاق صاحب سے برسبیل تذکرہ معلوم ہوا کہ کتب خانہ محمدیہ میں اب قاری کاپرے کو جاننے والا کوئی نہیں، انہیں یاد کرنے کے لیے صرف کسی کسی ورق پر نام لکھا ہوا رہ گیا ہے، جس سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ موصوف کون تھے، کہاں سے آئے تھے، کتب خانے کے اوپر جس کمرے میں قیمتی قلمی کتابیں رکھی ہوئی تھیں اور وہاں کسی کو پر مارنے کی جگہ نہیں تھی اور قاری

صاحب کو ہم نے پیرانہ سالی کے باوجود سیڑھی چڑھتے اور اپنے ہاتھ سے ان قیمتی جواہرات کو ہانپتے کانپتے لاتے اور لے جاتے دیکھا تھا، ان کی رحلت کے بعد فوراً خالی کرکے رہائش گاہ بنا دیا گیا تھا، اب کسی کو پتہ بھی نہیں ہے کہ انہوں نے وہاں کیسے قیمتی خزانے کو سینہ سے لگا کر محفوظ رکھا تھا۔

اس لا پروائی پر تین دہائیوں سے زیادہ عرصہ بیت چکا ہے۔ اس دوران کئی نسلیں گذر گئی ہیں، اس کے باوجود اگر اب اس کتب خانے کی یاد ذمہ داران کو آ گئی ہے تو یہ بھی قابل تعریف امر ہے، خدا کرے زمانے کی بے پروائی کے باوجود اب بھی قدرت کی کرم فرمائی سے پرکھوں کی امانت کا بڑا حصہ ضائع ہونے سے بچ گیا ہو، جن ہاتھوں نے علم و دانش کی قدردانی کرتے ہوئے آج کے اس مادی دور میں باقی ماندہ امانت کی آیندہ نسل کو منتقل کرنے کی ٹھانی ہے وہ واقعی قابل مبارکباد ہیں۔

دارالمصنّفین کا سلسلہ ہندی کتب

۱۔ محمد شبلی (غیر مجلد)	مترجم ڈاکٹر بابر اشفاق خاں	قیمت: ۶۰/روپے
۲۔ // // // (مجلد)	// // // //	قیمت: ۸۰/روپے
۳۔ رحمت عالم	// ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	قیمت: ۶۰/روپے
۴۔ حضرت عائشہؓ کی جیونی	// عبداللہ دانش	قیمت: ۲۳۰/روپے
۵۔ خطبات مدراس	// // // //	قیمت: ۱۲۵/روپے
۶۔ عرب و ہند کے تعلقات	// // // //	قیمت: ۲۰۰/روپے
۷۔ دین رحمت	// // // //	قیمت: ۲۰۰/روپے
۸۔ مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری (اول)	....	قیمت: ۱۲۵/روپے
۹۔ // // // (دوم)	....	قیمت: ۱۸۰/روپے
۱۰۔ // // // (سوم)	....	قیمت: ۲۲۵/روپے

اخبار علمیہ

”قدیم ترین مصحف کی دریافت“

برطانیہ کی برمنگھم یونیورسٹی کی لائبریری میں قرآن کریم کا قدیم ترین نسخہ دستیاب ہوا ہے۔ یہ نسخہ تقریباً ایک صدی سے مشرق وسطیٰ کی کتابوں اور دیگر دستاویزات کے انبار میں تھا لیکن اس پر ابھی تک کسی کی نظر نہیں پڑی تھی۔ جب حال ہی میں ایک ڈاکٹریٹ کے طالب علم نے اسے دیکھا تو ذمہ داروں نے اس کے صحیح سن کتابت کا پتہ لگانے کے لیے جدید طریقہ استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ آکسفورڈ یونیورسٹی کے ریڈیو کاربن ایکسلیٹر یونٹ کو یہ ذمہ داری سونپی گئی۔ نتیجہ میں یہ بات سامنے آئی کہ یہ نسخہ بکری یا بھیڑ کی کھال پر لکھا گیا ہے۔ اور اندازہ ہوتا ہے کہ کم ازکم ۱۳ ۷ ھ یعنی ۵۵۸ سے ۶۵۴ء کے درمیان اس کی کتابت ہوئی ہے۔ عیسائیت اور اسلام کے پروفیسر تھامس کا کہنا ہے کہ اس اندازے سے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ یہ اسلام کے چند سال بعد کا ہے۔ اس کا کاتب پیغمبر اسلام ﷺ کے زمانہ میں باحیات اور اس نے آپ ﷺ کو دیکھا تھا۔ جو نسخہ ملا ہے وہ موجودہ قرآن کے قریب تر ہے۔ اس سے اس بات کو تقویت ملتی ہے کہ اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی اور وہ جیسے نازل ہوا تھا ویسے ہی ہے۔ ایسے نسخوں کے برٹش لائبریری کے ماہر ڈاکٹر محمد عیسیٰ کا کہنا ہے کہ یہ بہت دلچسپ دریافت ہے اور اس سے مسلمان بہت خوش ہوں گے۔

(تفصیلی رپورٹ راشٹریہ سہارا ۲۱، ۲۳/جولائی کے شمارہ میں ملاحظہ فرمائیں)

”ہندوستان کی نو یونیورسٹیاں“

ٹائمز ہائر ایجوکیشن (ٹی ایچ او) نے ابھی حال ہی میں عالمی معیار کی حامل ۱۰۰/ ایشیائی یونیورسٹیوں کی فہرست جاری کی ہے جس میں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس ۳۷ ویں مقام پر ہے۔ گذشتہ سال اس مقام پر پنجاب یونیورسٹی تھی۔ اب وہ ۳۸ ویں درجے پر ہے۔ اس درجہ بندی میں اس سال ہندوستانی یونیورسٹیز کی تعداد ۱۰ سے گھٹ کر ۹ ہوگئی ہے۔ رڑکی، ممبئی، دہلی، کھڑک پور، مدراس کے آئی آئی ٹی ادارے، جواہر لعل یونیورسٹی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بھی چوٹی کی ۱۰۰ یونیورسٹیوں

میں شامل ہیں۔آئی آئی ٹی رڑکی کے زیر انتظام ہندوستان کے پانچ آئی آئی ٹی اداروں نے مشترکہ طور پر ۵۵واں درجہ حاصل کیا۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۹۰ پر اور جے این یو ۹۶ نمبر پر ہے۔ترکی کے چھ ادارے اس سال کی فہرست میں شامل ہوئے ہیں جو سب کے سب ۵۰ ٹاپ میں ہیں۔کنگ فہد یونیورسٹی آپ پٹرولیم ۱۷ اور کنگ سعود یونیورسٹی ۷۰ ویں درجہ پر ہے۔اس فہرست میں پاکستان کی کوئی بھی یونیورسٹی جگہ حاصل نہ کرسکی۔تازہ فہرست میں چین جاپان سے آگے نکل گیا ہے تاہم ایشیا کی نمبرون یونیورسٹی یونیورسٹی آف ٹوکیو ہے،جب کہ اس کی بہت سی یونیورسٹیوں نے اپنا مقام کھودیا ہے۔جاپان کی پچھلے سال ۲۰ یونیورسٹیاں شامل تھیں،اس بار ۱۹ ہی اس درجہ بندی میں آسکیں۔ چین کی تین نئی یونیورسٹیوں نے اس فہرست میں جگہ بنالی۔یہ پہلا موقع ہے جب ٹاپ سو میں چین کی یونیورسٹیز کی تعداد سب سے زیادہ یعنی ۲۱ ہے۔ہانگ کانگ نے اپنا مقام باقی رکھا ہے اور اس کی چھ یونیورسٹیاں ٹاپ ۵۰ میں شامل ہیں۔جنوبی کوریا ۱۳ یونیورسٹیز کے ساتھ اس فہرست میں تیسرا سب سے بڑا ملک ہے۔سنگاپور کی دو یونیورسٹی ہی اس میں شامل ہیں لیکن اس نے اس سال بھی اپنا دوسرا درجہ برقرار رکھا ہے۔نینیانگ ٹکنالوجیکل یونیورسٹی،ٹاپ ۱۰ میں پہلی مرتبہ منتقل ہوئی۔ کنگ مونگوٹ یونیورسٹی آف ٹیکنالوجی تھونبوری پانچ درجے گرکر ۵۵ ویں درجے پر دیگر اداروں کے ساتھ کھڑی ہے۔اس کے بعد ماہیڈول یونیورسٹی نو درجے گرکر ۹۱ ویں مقام پر آگئی ہے۔

(افکار ملی،جولائی ۲۰۱۵ء)

''تلنگانہ میں آن لائن انٹرنس ٹسٹ''

حکومت تلنگانہ نے ۳۵ فیصد ایم بی بی ایس کی انتظامی نشستوں کے لیے علاحدہ آن لائن انٹرنس ٹسٹ کو منظوری دی ہے۔فی الحال اس نئے صوبہ میں ۱۵ خانگی اور ۵ سرکاری طبی تعلیمی ادارے ہیں جن میں ۲۹۵۰ ایم بی بی ایس نشستیں ہیں۔خانگی سیٹیں اکیس سو ہیں،جس میں ۱۰۵۰ داخلے حکومتی کوٹہ کے تحت ہوتے ہیں۔بقیہ ۳۵٪ بی زمرہ کے لیے ہیں اور اس میں بھی ۳۵ فیصد انتظامیہ کی ہیں اور ۱۵ فیصد این آر آئی کوٹہ کے تحت ۳۱۵ نشستیں موجود ہیں۔اس کوٹہ کے تحت داخلہ حاصل کرنے والوں سے گیارہ لاکھ روپیوں تک وصول کرنے کے مجاز قرار دیے گئے ہیں۔ (گڈ کیئر،حیدرآباد،جون ۲۰۱۵ء)

’’عاملوں کے متعلق مشترکہ تحقیق میں انکشاف‘‘

پچھلے دنوں عرب اور افریقی جامعات کی ایک مشترکہ تحقیق میں انکشاف کیا گیا ہے کہ عرب ممالک میں توہم پرستی، جہالت اور ضعیف الاعتقادی کے سبب نام نہاد عاملوں اور جادوگروں سے اپنے خانگی اور دوسرے مسائل حل کرانے کے رجحان میں شدید اضافہ ہوا ہے۔ خرطوم کی یونیورسٹی ’’جامعہ مغتربین‘‘ میں منعقدہ ایک تقریب میں کہا گیا ہے کہ عرب ممالک کے عوام ساحروں اور عاملوں کو منہ مانگی رقم دیتے ہیں۔ جس سے مجموعی طور پر ان کو ہر سال ۵ / ارب ڈالر کی آمدنی ہوتی ہے۔ یہ تحقیق ’’الاسلام ومحاربۃ الجدل والشعوذۃ‘‘ کے نام سے کی گئی تھی۔ اس تحقیقی وفد کے سربراہ ڈاکٹر اسماعیل محمد ابراہیم نے عرب علاقہ میں جادو کی تاریخ، اسباب اور اجنہ کی حقیقت پر روشنی ڈالی، یونیسکو سے وابستہ ڈاکٹر تیسیر نعیمی نے ان کے بڑھتے ہوئے اثرات کا سبب شعور اور تعلیم کی کمی قرار دیا اور کہا کہ عرب ممالک میں مجموعی طور پر ۴۸ ملین افراد جاہل ہیں جو ترقی یافتہ ممالک کے مقابلہ سے کہیں زیادہ کم ہیں۔ انہوں نے اپنے خطاب میں جادو وغیرہ سے مقابلہ اور حفاظت کے لیے قرآن کریم کی تلاوت اور اذکار مسنونہ پر زور دیا۔

(جریدہ القدس العربی)

’’انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے ۳۲ ملین ڈالرز کا عطیہ‘‘

شہزادہ ولید بن طلال نے ایک کامیاب بزنس مین کی حیثیت سے مشرق و مغرب میں اپنا لوہا منوالیا ہے۔ ان کا شمار دنیا کے امیر ترین افراد میں ہوتا ہے اور کئی ہزار بلین ڈالر کے مالک ہیں۔ انہوں نے سعودی عرب سمیت دنیا کے مختلف ملکوں میں غربت کے خاتمے اور انسانیت کی فلاح و بہبود کی غرض سے ۳۲ ملین ڈالرز عطیہ دینے کا اعلان کیا ہے، بالخصوص دنیا کے ان تحقیقی اداروں کے ساتھ ان کا تعاون ہوگا جو دنیا میں پھیلی ہوئی مہلک بیماریوں کا علاج دریافت کرنے میں مشغول ہیں۔ اس کے علاوہ اس رقم میں قدرتی آفات سے متاثرین کا بھی حصہ ہوگا۔

(صراط مستقیم، برمنگھم، جولائی ۲۰۱۵ء)

ک، ص اصلاحی

معارف کی ڈاک

محمد اختر مسلمؔ مرحوم

۲۳/۷/۲۰۱۵ء
مکان نمبر ۹ ۷ ۱۳، گلی نمبر ۳۶،
فیز۴، بحریہ ٹاؤن راول پنڈی، پاکستان

مکرمی و محترمی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ محترم ڈاکٹر مرزا احسن علی بیگ اور محترم ڈاکٹر سلیم اختر صاحب کی وساطت سے معارف جولائی ۲۰۱۵ء کی برقیاتی جلد موصول ہوئی۔ والد گرامی محمد اختر مسلمؔ مرحوم پر مضمون کے لیے شکر گزار ہونے کے ساتھ معذرت خواہ ہوں کہ ان کی رحلت کی بروقت اطلاع نہ دے سکا۔

۷/ستمبر ۲۰۱۴ء کو والد محترم مختصر علالت کے بعد انتقال فرما گئے تھے، جس کے صدمے سے ابھی تک بکھرے ذہن وحواس سمٹ نہیں سکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، آمین۔ جیسا کہ آپ کے علم میں ہے کہ والد محترم تمام عمر ترقی پسند فکر اور اسلامی مساوات کے مبلغ اور شارح رہے۔ قرآن پاک، سیرت طیبہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، غالب اور اقبال ان کے پسندیدہ موضوعات رہے ہیں۔ محترم فیض احمد فیض مرحوم کے لیل ونہار، محترم حنیف رامے مرحوم کے نصرت، روزنامہ جنگ، ادارہ تحقیقات اسلامی کے فکر ونظر سمیت ملک کے دیگر موقر جریدوں واخبارات میں ان کے شائع ہونے والے مضامین اور تحریر وتالیف کردہ کتب ''شہید کربلا'' و ''قرآن اور انسانی حقوق'' سبھی میں وہ سرمایہ داری، جاگیرداری اور ظلم واستحصال کے خلاف لکھتے رہے۔ ان کی لائبریری میں قرآن پاک کی بے شمار تفاسیر وسیرت طیبہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نسخے، دیگر دینی وترقی پسند لٹریچر کے ساتھ ساتھ تاریخ، فلسفہ، سیاست، ادب اور شاعری کا ایک قابل ذکر ذخیرہ موجود ہے، جو ہمارے لیے تمام عمر کا اثاثہ اور

ان کے لیے انشاءاللہ صدقہ جاریہ ثابت ہوگا۔

والد محترم کے تمام مضامین، خطوط، ان کی کتب پر اخباری، علمی وادبی حلقوں کے تبصرے اوران کے فن وشخصیت پر احباب کے تاثرات کی اشاعت کا اہتمام کیا جارہا ہے، جس میں کامیابی کے لیے آپ کی دعاؤں کی اشد ضرورت ہے۔اس سلسلے میں اگر آپ کے پاس ان کے خطوط ہوں تو ازراہ کرم ان کا عکس عنایت فرمادیں تو ممنون رہوں گا۔ والسلام

(جناب) محمد یاسر عرفات مسلم

تصحیح

۷/۷/۲۰۱۵ء
گوشۂ مطالعات فارسی
پوسٹ بکس نمبر ۱۱۴
علی گڑھ، ۲۰۲۰۰۱

برادر گرامی زادت عنایتکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بالآخر جون کا ''معارف'' پہنچ ہی گیا، متشکر ہوں۔

''شعاع نوا'' پر آپ کا تبصرہ مختصر سہی مگر معتبر اور اہل فہم کے لیے کئی لطیف نکات کا روشن گر ہے۔ جزاکم اللہ۔

غزل کے شعر نمبر ۴ کے پہلے مصرعے میں ''کچھ'' سے پہلے لفظ ''بہت'' تھا جو مطبوعہ شکل میں سب (س ب) ہوگیا ہے اوراس تبدیلی سے شعر کا وزن اور معنی دونوں متاثر ہوگئے ہیں۔

جویائے خیر

(ڈاکٹر) رئیس احمد نعمانی

وفیات

اے پی جے عبدالکلام مرحوم

معارف کا یہ شمارہ تیار ہو چکا تھا کہ اچانک ۲۸؍ جولائی کی شام خبر آئی کہ ملک کے سابق صدر اور مشہور سائنس داں، دانش ور اور حکیم و شاعر جناب عبدالکلام کا وقت آخر شیلانگ آسام میں ایک تقریر کے دوران آگیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

وہ ملک کے گیارہویں صدر تھے، ان سے پہلے اور بعد بھی اس مسند صدارت کو اصحاب فضل و کمال رونق بخشتے رہے، لیکن عبدالکلام کی وفات کا سانحہ کچھ عجب سا ہی رہا، پورا ملک یوں ماتم گسار کم ہی ہوا ہوگا، عوام کے صدر، فاتح قلوب، محبوب نوجوانان جیسے خطابات، دلوں سے نکل کر زبانوں پر آگئے۔ یہ ان کی غیر معمولی مقبولیت کی دلیل ہے۔ اور اس میں صرف ان کے عہدہ صدارت یا سائنسی اداروں میں ان کی لیاقت ہی کا دخل نہیں، ان کی پوری زندگی ایسی رہی جو ہر خاص و عام کے لیے ایک کشش و جاذبیت اور دوسروں کے لیے تقلید اور نمونہ بننے کا پیغام رکھتی تھی۔

وہ ۱۵؍ اکتوبر ۱۹۳۱ء میں تامل ناڈو کی ایک ساحلی بستی رامیشورم میں پیدا ہوئے۔ ابوالفاخر زین العابدین عبدالکلام پورا نام تھا۔ ایک عام اور متوسط درجہ کے گھر سے ہندوستان کے قصر صدارت تک کا ان کا سفر کسی سندباد کی طرح واقعی بڑا دلچسپ اور حیرت انگیز ہے۔ بچے تھے لیکن یہ معاشی ضرورت تھی کہ ایک بچہ کشتی میں مسافروں کو ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پہنچانے پر مامور ہوا، یا اخبار کو گھر گھر پہنچانے کے لیے مجبور ہوا۔ ایسی ابتدا اور پھر ایسی انتہا، ان کی داستان حیات کو دلچسپ اور دلکش ہونا ہی تھا۔ والد محلہ کی مسجد کے امام تھے، ان کو بیٹے میں کچھ ایسے جوہر نظر آئے کہ ان کے دل میں بیٹے کو کلکٹر کی شکل میں دیکھنے کی خواہش ہوئی اور پھر وہ سفر شروع ہوا جو خوابوں کو حقیقت میں بدلنے والا تھا، ترو چلا پلی کے سینٹ جوزف سے بی ایس سی اور انجینئر نگ اور خلائی ٹکنالوجی کی اعلیٰ تعلیم تک عبدالکلام کی زندگی مسلسل بلندیوں کا سفر کرتی گئی۔ شروع میں بہن کے زیور کو رہن رکھنے والے نے صرف پرانے قرض ہی کو

نہیں اتارا، انہوں نے وہ قرض بھی اتار دیا جو جابر بن حیان، ابوجعفر خوارزمی، یعقوب کندی، فارابی و زہراوی کی نسل پر موجودہ صدی میں واجب الادا تھا۔ یہاں یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ٹیپو سلطان نے میزائیل بنانے کا جو خواب دیکھا تھا اس کو بھی انہوں نے سچ کر دکھایا۔ فضائے بسیط میں کمندیں ڈالنے اور نیوکلیائی علوم میں جدت وایجاد سے انہوں نے ملک کا نام تو روشن کیا ہی اپنی قوم کے بھی سرخ رو ہونے اور سرخ رو رہنے کی راہ روشن کر دی۔ ان کے اعتراف میں بجا طور پر کہا گیا کہ "انہوں نے ہندوستان سے باہر بہت کم وقت گزارا، ان کا علم اور تجربہ دونوں غیروں کے رہین منت کم ہی رہے"۔ ناسا وہ ضرور گئے لیکن بہت کم مدت کے لیے، وہ واپس آئے تو نندی، روہنی، ترشول، پرتھوی راکٹ اور میزائیل بنا کر وہ بے کراں و بسیط فضا و خلا میں محو جستجو رہے، یہ ایک طویل داستان ہے جس کا نمایاں پہلو یہ بھی ہے کہ وہ اپنے خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کرنے میں صرف راکٹ اور سیارچے ہی نہیں ان کو تیار کرنے والوں کی ایک جماعت بھی تیار کرتے رہے، سائنسی ادارے میں تجربوں کے ساتھ وہ سائنس کی تعلیم میں بھی اسی درجہ منہمک رہے، زندگی کا کوئی لمحہ بھی ان کے لیے اس آرام کا مستحق نہیں رہا جو حقیقتاً آرام ہے بھی نہیں۔

۲۰۰۲ء میں جب جمہوریہ ہند کے عہدہ صدارت کے لیے ان کا نام سامنے آیا تو ان کے کلام بلکہ کارناموں کے باوجود یہ اعلان بہتوں کے لیے حیران کن تھا، وجہ بھی تھی کہ ان کے علم کی دنیا سیاست کی دنیا سے کہیں دور تھی، کچھ لوگوں نے اسے ایک پارٹی کی ووٹ بینک کی سیاست کا شاخسانہ سمجھا تو کچھ نے اسے عالمی اعلیٰ طاقتوں کی سازش پر محمول کیا لیکن سیاست اور سائنس کا یہ سلسلہ سمجھ سے کتنا ہی پرے ہو، وہ اس پل صراط سے بھی بے نیازانہ اس طرح گزرے کہ قصر صدارت کی شاہانہ زندگی نے دیکھا کہ شاہی میں فقیری کا رنگ کتنا جدا اور کیسا دلکش ہوسکتا ہے۔ یقین محکم اور عمل پیہم کی تابنا کی، نقش ونگار کی ظاہری چمک دمک سے کتنی زیادہ ہوتی ہے، کچھ کر گزرنے کی بھوک بے شبہ دوسرے تمام اسباب ہوس سے بہر حال طاقت ور ہوتی ہے۔ ان کے مختصر دور سیاست سے ایک طبقہ غیر مطمئن نظر آسکتا ہے، ایسا نہیں کہ ایک حکیم و دانشور حالات کی حقیقت سے بے خبر رہا ہو، انہوں نے اصل مرض کو دیکھا اور اپنے عہدہ کو پورے ملک میں تعلیم اور اس سے بھی زیادہ انسان کے تزکیہ و تربیت کی علامتی اصطلاحوں کے سہارے کے بغیر، سب سے موثر ذریعہ بنا دیا، ایسا لگا کہ وہ ہر راہ پر چراغ آرزو روشن کرنے کی مہم میں ہیں، شاید ان کی اب تک کی زندگی نے ان کو یہی سکھایا تھا کہ ع دوا ہر دکھ کی ہے مجروح تیغ آرزو رہنا

یہی جذبہ ایک ولولہ تازہ میں بدلا جس کو انہوں نے نئی نسل کو سونپنے میں ذرا بھی دریغ نہیں کیا۔ وہ لوگوں خصوصاً طلبہ سے ہم کلام ہوتے رہے اور ایک نئے علم کلام سے آشنا کرتے رہے، ان کی کئی کتابیں شائع ہوئیں، انڈیا ۲۰۲۰ ونگس آف فائر، گائڈنگ سولس، ڈائیلاگ آن دی پرپز آف لائف، مائی جرنی وغیرہ۔ ہر کتاب تجربوں اور حکمتوں کا خزانہ، قبولیت بھی بے مثال، لاکھوں کی تعداد میں یہ کتابیں، سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتابوں کی فہرست میں شامل ہوتی رہیں۔ یہ اعزاز شاید ان کے بھارت رتن سمیت تمام اعزازات سے زیادہ ہے۔ لیکن یقین و عمل کے علاوہ جس خوبی نے ان کو یادوں میں بسائے جانے کے قابل بنایا وہ ان کا جذبہ احترام آدمیت اور پیام محبت ہے، انسانوں کے احترام اور بنی آدم کے اکرام کا سرچشمہ، انکسار و تواضع ہے اور عبدالکلام نے جس طرح احساس تفوق و پندار کو شکست دے کر خاکساری کو اپنایا، اس کا نظارہ کم از کم آج کی دنیا کے لیے انوکھا مشاہدہ تھا۔ افکار کتنے ہی عمیق ہوں، لذت کردار کے بغیر وہ بے روح ہیں، مرحوم کے ذکر میں قرآن مجید سے ان کے تعلق کی بات ہوتی ہے، یہ بات سامنے نہ آتی تو بھی ان کا سارا کردار خود ایک سچے مسلمان ہونے کی شہادت دیتا ہے، انہوں نے شادی نہیں کی، ایک بار انہوں نے کہا کہ ابوالفاخر اور زین العابدین کی نسل میرے ذریعہ آگے نہیں رہے گی لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت بے پایاں ہے، اس کی وسعت ہمیشہ رہے گی کیونکہ اصل زندہ و قائم تو صرف اسی کی ذات ہے۔ یہ علم انفس و آفاق کے دیدہ وری کے جذبات ہو سکتے ہیں، افزائے نسل اپنی جگہ لیکن افزائے علم بھی ایک حقیقت ہے اور عبدالکلام کے لیے تو یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ

ع تھی تری موج نفس باد نشاط افزائے علم

یقیناً وہ ان لوگوں میں تھے جن کے لیے اہل نظر اس قسم کے جملے لکھ گئے ہیں کہ ان میں فطری عظمت تھی، وہ فلسفیانہ فکر، مجتہدانہ دماغ اور مجاہدانہ جوش عمل رکھتے تھے۔ مقصد حیات کی بلندی، قلندری کا بانکپن، محبت کی قوس قزح، اخلاص کی شفق، علم کی گہرائی اور شاہانہ ماحول میں پر از عظمت انکسار جن سے عبارت ہے اور جن کو اپنے رب سے ملنے سے پہلے دنیا کی اس آزمائش گاہ سے رخصت ہوتے وقت یہ کہنے کا حق ہے کہ شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

اللہ تعالیٰ ان کے اچھے کاموں کو قبول فرمائے اور لغزشوں اور سیئآت سے درگزر فرمائے آمین۔

ع۔ص

ادبیات

نعت

ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی*

نہیں تھا سہل کہ ہو انؐ کی نعتِ پاک رقم
مرے قلم پہ ہے اللہ کا یہ خاص کرم

ہوئے جو دل سے مطیع نظامِ شاہِ امم
انہیں کے قدموں میں تھے تخت و تاج قیصر و جم

کرے گا کیا کوئی رفعت کا انؐ کی اندازہ
کہ آئے ہفت سماوات جن کے زیر قدم

خدا نے جتنے کمالات خلق کو بخشے
حبیب خاصؐ کو بخشے تمام کرکے بہم

ہر اک پہ انؐ کی اطاعت ہے فرض حشر تلک
عرب سے اس کا تعلق ہو، یا ہو اہل عجم

بلند کیوں نہ ہوں رتبے ان اہل ایماںؓ کے
جنھوں نے دین کی خاطر سہے ہزار ستم

ورق ورق پہ ہے تصویر کعبہ و طیبہ
حسیں ہے کتنا مرے قلب و ذہن کا البم

حبیب حقؐ کی محبت کا فیض ہے کہ رئیسؔ
نہ کرسکا مجھے مائل جہاں کا کوئی صنم

مناجات

جناب فاخرؔ جلال پوری**

الٰہی بزمِ ایماں کو ضیائے شمعِ وحدت دے
ہمارے قلب میں حبِّ ناموسِ رسالت دے

اگر احساس میں فطرت میں اسلامی حمیت دے
تو میرے دینے والے دل میں دردِ قوم وملت دے

جہانِ زندگی میں ہو رہا ہے ذکر پستی کا
عطا کر قوت بازوئے ہمت، ذوقِ رفعت دے

---

* گوشۂ مطالعات فارسی، پوسٹ بکس نمبر ۱۱۴، علی گڑھ، ۲۰۲۰۰۱۔

** جلال پور، ضلع امبیڈکر نگر، یوپی ۲۲۴۱۴۹۔

کلی کے حال پر یہ کہہ کے شبنم رات بھر روئی شگفتِ گل کے دامن کو ثباتِ رنگ و نکہت دے
پیامِ زندگیٔ جاوداں سنتے رہیں کب تک ہمیں اب رسم شبیری ادا کرنے کی ہمت دے
اگر توفیق تعمیر نشیمن دے عنادل کو تو صحنِ گلستاں کو بھی بہارِ نو کی رنگت دے
اگر دینا ہے سامانِ نشاطِ زندگی یارب تو پہلے قلب کو دردِ غمِ پنہاں کی لذت دے
حیاتِ تازہ کی ہر اک تمنا جذب ہوجائے ہمارے ظرف کے دامن میں یارب اتنی وسعت دے

ہجومِ کشمکش ہے اور بحثِ نور و ظلمت ہے
زمانے کو ابوبکرؓ و عمرؓ کی پھر ضرورت ہے

غزل

ڈاکٹر جمیل مانوی

بزم امکاں میں ہیں پیدا نئے امکاں مجھ سے محفل ناز ہوئی آئینہ ساماں مجھ سے
میں ہوں، اس بارِ امانت کو اٹھانے والا مجھ سے ہے، بزم تمنا میں چراغاں مجھ سے
اک ابد گیر حقیقت ہے مرا عشق اگر کس لیے رکھا ہے پھر جلووں کو پنہاں مجھ سے
سوچتا ہوں، تو کہیں میرے ہی اطراف میں ہے ورنہ کیوں کھیلتے رہتے ترے ارماں مجھ سے
میری ہمت نے اٹھادی رخ فطرت سے نقاب عافیت کوش ہیں سب کوہ و بیاباں مجھ سے
زندگی تیرے تسلسل کا ہے ادراک مجھے موت یہ سوچ کے رہتی ہے پریشاں مجھ سے
بار بار آنا ، میرے ذہن پہ دستک دینا جانے کیا چاہتی ہے عمرِ گریزاں مجھ سے
اپنی مرضی سے فقیرانہ بسر کرتا ہوں میرے احباب ہیں بے وجہ پشیماں مجھ سے

مجھ سے بہتر، مرے ماضی کو سمجھتا ہے جمیلؔ
میرا دشمن ، کہ جو رہتا ہے ہراساں مجھ سے

سہارن پور۔

مطبوعات جدیدہ

عبدالسلام ندوی کی ادبی خدمات (تنقید کے حوالے سے): از ڈاکٹر گلشن طارق، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات ۶۰۰، قیمت ۵۰۰ روپے، پتہ: مولانا عبدالسلام ندوی فاؤنڈیشن، ۸۔ پہلا منزلہ، ہندوستان بلڈنگ ۲/۱۰۔ ٹی، پی اسٹریٹ، ممبئی ۴۰۰۰۰۴۔

مولانا عبدالسلام ندویؒ کی کتابوں میں شعرالہند اور اقبال کامل کی شہرت محتاج تعارف نہیں، ان کے علاوہ ان کے ادبی مضامین کا مجموعہ مقالات عبدالسلام کے نام سے ہے، تذکرہ وسوانح نگاری، مولانا مرحوم کے موضوعات میں سب سے نمایاں ہے، مذکورہ کتابیں اسی زمرہ میں ہیں لیکن چونکہ مولانا فطری ادیب اور نکتہ سنج ناقد تھے اس لیے ادبی وتنقیدی حیثیت سے بھی ان کی کتابوں کا درجہ بہت بلند ہے۔ مولانا کے ادب اور ان کے تنقیدی مقام پر چند عمدہ مقالات اور کتابیں آچکی ہیں لیکن زیر نظر کتاب میں جس تفصیل اور اطناب سے ان کا مطالعہ وجائزہ وتجزیہ چھ سو صفحات میں کیا گیا ہے، وہ واقعی قابل داد ہے، اصلاً یہ ڈاکٹریٹ کا مقالہ ہے جس میں اصل موضوع کے تین سو ساٹھ صفحات ہیں، باقی میں مولانا کے حالات، ان کے منفرد انداز زندگی اور ان کی تمام تصنیفات پر کہیں تفصیل، کہیں اختصار سے نظر کی گئی ہے، اس تمام محنت، جستجو اور دیدہ ریزی کا نتیجہ اس ضخیم اور اسی درجہ مفید کتاب کی شکل میں سامنے آیا، مزید معلومات کے لیے چند ضمیموں کا بھی اہتمام کیا گیا، عموماً اس قسم کے مقالات زوائد سے خالی نہیں ہوتے، مثلاً تنقیدی بحث میں فن تنقید کے مالہ وماعلیہ، تذکرہ میں تذکرہ نگاری کی تاریخ اور ان کے ابتدائی وارتقائی مراحل کا ذکر ضروری سمجھا جاتا ہے، اس کتاب میں بھی یہی انداز ہے تاہم سلیقہ سے ہے۔ یہ بات اور ہے کہ اقتباسات کی بھرمار میں خود مقالہ نگار کی آواز دبی سی نظر آتی ہے۔ اچھا یہی ہوتا کہ مقالہ نگار کو اپنے وجود کا احساس ہوتا۔ ایک محقق کے لیے مولانا کی شخصیت میں کے علمی وادبی سرمایہ سے کہیں زیادہ مقامات فکر ونظر ہیں، ان کی وفات کے بعد ان کو سب سے زیادہ قریب سے دیکھنے والوں کی کچھ تحریروں نے مولانا کی درون وبیرون خانہ شخصیت کی کچھ ایسی پردہ کشائی کی کہ ان کی زندگی ستاروں کی طرح پراسرار نظر آنے لگی کہ ہیں کو اکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ۔ دوسرے رازوں کی طرح اسے بھی سربستہ رہنے دیا جاتا تو بہتر ہی ہوتا لیکن اب مولانا کی شخصیت کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے ان پر نظر ڈالنا ایک ناگزیر مرحلہ ہے، جس سے گزرنے میں لغزشوں کا خطرہ بہرحال رہتا ہے اور اس کتاب میں اس کا نتیجہ کئی جگہ سامنے آیا،

مثال کے لیے صرف یہی جملے کافی ہیں کہ ''سید سلیمان ندوی اور مسعود علی ندوی نے دارالمصنّفین کا ناظم ہونے کی وجہ سے جائیدادیں بنائیں، بڑے بڑے لوگوں سے تعلقات بنائے، بیرون ملک کے دورے کیے ......'' اور بھی بہت کچھ ہے، جن سے یہ کتاب گراں بار ہے۔ ابتدائیہ میں لکھا گیا کہ علامہ شبلی نے دارالمصنّفین کے لیے اپنی ساری جائداد ادارے کے نام کردی، اس میں ساری کا لفظ تحقیق طلب ہے۔ مولانا ندوی کا مزار علامہ شبلی کے مزار سے متصل نہیں ہے بلکہ کچھ دوری پر مولانا مسعود علی ندوی کی قبر کے قریب ہے۔ ایک جگہ لکھا گیا کہ ''عبدالسلام ندوی کی تاریخ نویسی میں کچھ سقم ہے'' اس کی بڑی وجہ یہ بتائی گئی کہ ''وہ ایک بار لکھنا شروع کرتے ہیں تو پھر لکھتے ہی جاتے ہیں ...... فطری بات ہے کہ جب حالات و واقعات کی صحیح چھان بین نہ ہوگی تو ان میں کہیں نہ کہیں خرابی رہ جائے گی'' افسوس کہ مولانا ندوی کے لیے جن باتوں کو ضروری قرار دیا گیا خود کو اس سے مستثنیٰ ہی رکھا گیا۔ تحقیق میں ادعائیت اچھی نہیں جیسے یہ کہ ''انہوں نے زندگی کے ہر موضوع پر قلم اٹھایا'' اور بھی بعض جملے ہیں جن پر نظر ثانی کی ضرورت ہے مثلاً ''عبدالسلام اگر ندوۃ العلماء میں نہ پڑھتے تو شاید کسی مدرسہ میں خطیب یا عربی کے استاد بن جاتے'' ''انہوں نے ثابت کیا کہ وہ اچھے واعظ ہی نہیں اچھے مصنف بھی ہیں''۔ تحریر کی نوخیزی ان نزاکتوں کا احساس نہیں ہونے دیتی، یقین ہے کہ رفتہ رفتہ پختگی آہی جائے گی، مجموعی اعتبار سے مولانا عبدالسلام ندوی پر یہ سیر حاصل کتاب ہے، مولانا عبدالسلام فاؤنڈیشن نے اس سے پہلے مولانا کی یا ان سے متعلق نو کتابیں شائع کی ہیں، اس کتاب سے تلك عشرۃ کاملہ کا جملہ بھی کامل ہوگیا، اس کے لیے فاؤنڈیشن اور اس کی روح جناب محمد ہارون اعظمی مبارک باد کے مستحق ہیں۔

نقوش دوام (سوانح مولانا قاری شریف احمد گنگوہیؒ): مرتب مولانا محمد ساجد کھجناوری قاسمی، قدرے کلاں تقطیع، کاغذ و طباعت عمدہ، مجلد، صفحات ۴۲۴، قیمت ۲۰۰ روپے، پتہ: دفتر اہتمام جامعہ اشرف العلوم رشیدی، گنگوہ، سہارن پور، یوپی۔

مغربی یوپی میں گنگوہ کی بستی بھی تھانہ بھون، کاندھلہ، کیرانہ وغیرہ جیسی بستیوں کی طرح نیک نام اور مردم خیز رہی ہے، شیخ عبدالقدوس گنگوہی اور مولانا رشید احمد گنگوہی کے وجود نے اس سرزمین کو مسعود بنادیا، زیر نظر کتاب بھی اسی سلسلہ مبارکہ کے ایک اور نامور اور اسم بامسمیٰ مولانا شریف مرحوم کے حالات اور ان کے متعلق اکابر و معاصرین و متوسلین کے خیالات کا مجموعہ ہے۔ مولانا قاری شریف مرحوم کے حالات سے ان کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ انہوں نے زندگی کی جدو جہد اور کامیابیوں کو نام و نمود کے لیے نہیں بلکہ

پوری زندگی شہرت سے دور رہ کر محض مقصد کے حصول کے لیے خاموشی اور پوری ایمان داری سے وقف کردی، ۱۹۴۴ء میں انہوں نے زمانۂ تعلیم میں مدرسہ اشرف العلوم رشیدی کی بنیاد رکھی اور یہ تقویٰ اور رضائے الٰہی کی ایسی بنیاد تھی کہ آج یہ مدرسہ پرشکوہ عمارتوں اور سینکڑوں طلبہ سے معمور ہے، ایسی با عمل، بامقصد اور کامیاب زندگی کے مطالعہ میں دوسروں کے لیے نفع ہے اور تقلید و اتباع کا پیغام بھی ہے۔ سینکڑوں علماء کی تحریروں سے مزین اس کتاب کو بڑے سلیقہ سے مرتب کیا گیا، لائق مرتب خود بھی اچھے صاحب قلم ہیں، ترتیب و تدوین میں بھی ان کی خوش سلیقگی لائق تحسین ہے۔

اماونت، این ان نون سویلائزیشن: از جناب اکھلیش چندر اپادھیائے، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۱۷۶، قیمت ۲۵۰ روپے، پتہ: نوشن پریس، ۵، متھو کلاتھی اسٹریٹ، ٹیر پلی کین، چنئی ۶۰۰۰۰۵۔

ہند و ایران کی تاریخ و تہذیب کے قدیم نشانوں کی تلاش کی ایک بڑی دلکش کوشش یہ کتاب ہے، اس کے مصنف کا خیال بلکہ یقین ہے کہ تہذیبیں کبھی معدوم نہیں ہوتیں، ان کے وجود میں دوام کے عناصر کارفرما رہتے ہیں، ہر نئی تہذیب، پرانی نظر آتی تہذیب کا عکس ہی ہوتی ہے، ہر چیز اندرونی طور پر ایک دوسرے سے رشتہ رکھتی ہے، یہاں تک دیوتا اور اوتار بھی، ژنداوستا کا آہورا مترا، آریائی ویدوں کا مترا، پارسیوں کا مہر یا روم کا متھریم، مصنف کے نزدیک یہ سب ایک ہیں، ہاں تہذیب کے عملی ابعاد، وقت کے ساتھ تغیر پذیر ہوتے ہیں، عمارتیں، کھنڈر ہو جاتی ہیں، بستیاں ویران ہو سکتی ہیں لیکن نظریات، عقائد اور دانش دین بہرحال باقی اور ترقی پذیر رہتے ہیں، ان خیالات نے مصنف کو ساسانی عہد کے ایران میں زردشت اور اس کے مذہب اور کتابوں کے مطالعہ کی جانب راغب کیا۔ اوستا اور ژند سے دلچسپی پیدا کی، اوستا ہو یا یسنا جو سنسکرت میں یجن ہے یا پھر آتش و آفتاب پرستی و زناری ہو یا جانوروں کی قربانی کا امتناع ہو، قدیم ہندو مذہب و تہذیب کی مماثلتوں نے مصنف کو اور بھی کچھ جاننے اور مفروضوں کو قطعیت دینے پر آمادہ کیا، اس کتاب میں انہوں نے اوستائی گاتھاؤں کے اشاروں کو قطعیت دینے کی کوشش کی، آغاز ہی ایک ایسے اوستائی اشلوک سے کیا جس کا مطلب ہے ''کتنی دور ہماری بستیاں ہیں، ہمارا وطن ہم سے کتنا دور ہے'' یعنی اوستا والے قدیم ایرانی جانتے تھے کہ ان کی اصل کہاں ہے اور یہ ہجرت ان کو کہاں لے آئی ہے۔ اس نکتہ کو مصنف نے مورخین کے بیانوں میں ڈھونڈا اور پھر رشتوں کی ڈور سلجھنے لگی، ویدک سنسکرت اور اوستا کے باہمی رشتوں کی نزدیکی اور واضح ہوئی کہ

قریب ہر اوستائی لفظ کا مشابہ لفظ سنسکرت میں بھی ہے۔ کتاب کے نو بابوں میں یہی نہج ہے، اردوی سر، اماونت، زردشت، اس کا مذہب، بدھ، ہند ایران میں ذات کا چلن نیرو سنگھم، رام، ناٹ اے متھ ان موضوعات میں علم الہند سے تعلق رکھنے والوں کے لیے مصنف سے متفق ہونے کے امکانات خواہ محدود ہوں لیکن دلچسپی کے اسباب ضرور ہیں، اوستا کا اماونت، دراصل ارض ہند ہے اور یہ نام آریوں سے پہلے کا ہے جس کا مطلب دریاؤں کی زمین ہے، اس بات کو ثابت کرنے کے لیے مصنف نے جس دیدہ ریزی کا مظاہرہ کیا ہے، وہ دیکھنے کے لائق ہے۔ حیرت ان نکات پر نہیں مصنف پر ہے جو ہندوستانی فوج میں کمیشنڈ آفیسر رہے، بعد میں وہ یوپی ہوم گارڈ میں ڈویژنل کمانڈنٹ رہے، ایسے فرائض کے ساتھ سنسکرت اور پارسی و پہلوی زبانوں سے واقفیت اور اوستاو ژند کے مطالعہ کی ہمت واقعی قابل داد ہے اور لائق مبارک باد بھی۔

ریحان خرد: از ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۰۸، قیمت ۱۱۹ روپے، پتہ: ساحل کمپیوٹرس، حیدری روڈ، مومن پورہ، ناگپور، مہاراشٹر۔

فاضل مصنف کا تخلص ساحل ہے لیکن حقیقتاً وہ یم بہ یم، جو بہ جو ہیں، ان کی کتابوں کا تسلسل اور اس سے بڑھ کر ان کا تنوع حیرت انگیز ہے، شاعری میں نو مجموعے، تحقیق و تنقید میں نو مجموعے، تاریخ میں پانچ، تنقید محض میں تین، تدوین میں چار، شرح و تفہیم میں چھ اور متفرقات میں چار کتابیں، اب ان میں ریحان خرد نیا اضافہ ہے۔ کتاب کی وجہ تسمیہ جو بھی ہو، ساحل صاحب کا دل اپنے شہر ناگپور کی محبت سے معمور ہے اس کتاب میں جن ادیبوں اور شاعروں کی فکری، علمی، ادبی، شعری کاوشوں کا ذکر ہے، ان سب کا تعلق کسی نہ کسی شکل میں ناگپور یا نواح ناگپور سے ہے، اس تعلق نے ساحل صاحب کو اپنے ہم وطنوں کے کمالات کے اظہار پر مجبور کیا، حمید ناگپوری، شاطر حکیمی، طرفہ قریشی، سوز خضرائی نانی ناگپوری، شارق جمال، نیر انصاری وغیرہ قریب چوبیس اہل قلم کا ذکر ہے۔ ساحل صاحب کا کبھی نہ تھکنے والا قلم ان فنکاروں کا تعارف کراتا اور ان بستیوں کو جگاتا رہا جو اردو سے وابستگی کی وجہ سے نیک نام ہوئیں لیکن اب اردو کو ان کی غفلت سے شکوہ ہے۔ ناگپور، اردو بستی نہیں لیکن ساحل صاحب ایک مدت سے دوسروں کو یقین دلاتے رہے ہیں کہ ناگپور میں اردو بستی ہے۔ اردو علم و ادب کے ایسے خدمت گزار قابل رشک ہیں اور یقیناً دوسروں کے لیے قابل تقلید مثال بھی۔

ع۔ص

رسید کتب موصولہ

(۱) الشیخ شبلی النعمانی، حیاته و افکاره: د۔محمود حافظ عبدالرب مرزا، عرشیہ پبلیکیشنز، اے۔۱۷۰، گراؤنڈ فلور، سوریہ اپارٹمنٹ، دلشاد کالونی، دہلی۔ قیمت=/۳۵۰ روپے

(۲) حرف تمنا: جمیل احمد جائسی، مریم سعیدہ سی۔۹۰۱/۴، لیجنڈ اپارٹمنٹ سیکٹر، ۵۷ گڑگاؤں۔ قیمت=/۲۰۰ روپے

(۳) شان جنوب (علیم صبانویدی کے فن اور شخصیت پر مضامین کا انتخاب): ڈاکٹر قاضی حبیب احمد، تمل ناڈو اردو پبلی کیشنز، چنئی۔ قیمت=/۵۰۰ روپے

(۴) طبی اردو مخطوطات اہمیت، افادیت اور ضرورت: ڈاکٹر اشہر قدیر، رامپور رضا لائبریری، رامپور۔ قیمت=/۳۵۰ روپے

(۵) علامہ شبلی صدی کے آئینہ میں: ڈاکٹر مہ جبین زیدی، قرطاس، فلیٹ نمبر ۱۵۔اے، گلشن امین ٹاور، گلستان جوہر بلاک، ۱۵، کراچی۔ قیمت=/۶۰۰ روپے

(۶) علم عجائب گھر اور علم آثار قدیمہ: ڈاکٹر انل کھٹارے، ڈاکٹر وجیا ساکھرے، ڈاکٹر گوتم پاٹل، مترجم: ڈاکٹر سید رضوانہ تبسم، مرزا ورلڈ بک ہاؤس، قیصر کالونی، شاہ گنج، اورنگ آباد، مہاراشٹر۔ قیمت=/۱۲۰ روپے

(۷) کلیم احمد عاجز: پروفیسر محسن عثمانی ندوی، ہدیٰ پبلی کیشنز، حیدرآباد۔ قیمت=/۲۹۶ روپے

(۸) نثر پارے: ڈاکٹر ابرار اعظمی، سوشل ایجوکیشن فاؤنڈیشن، خالص پور، اعظم گڑھ۔ قیمت=/۲۰۰ روپے

(۹) نعت نامے بہ نام صبیح رحمانی: ڈاکٹر محمد سہیل شفق، نعت ریسرچ سینٹر، بی۔۳۰۶، بلاک ۱۵ گلستان جوہر، کراچی۔ قیمت=/۱۰۰۰ روپے

(۱۰) نکات سخن۔تدوین وتنقید: ذکیہ رخشندہ، بھارت آفسیٹ بلیماران، دہلی۔ قیمت=/۲۰۰ روپے

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

سیرۃ النبیؐ جلد اول ودوم (یادگار ایڈیشن)	2000/-	موازنہ انیس ودبیر	100/-
سیرۃ النبیؐ		اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر	85/-
(خاص ایڈیشن مکمل سیٹ ۷ جلدیں)	2200/-	سفرنامہ روم ومصر وشام	100/-
علامہ شبلی وسید سلیمان ندوی		کلیات شبلی (اردو)	180/-
مقدمہ سیرۃ النبیؐ	30/-	کلیات شبلی (فارسی)	45/-
الفاروق	300/-	مقالات شبلی اول (مذہبی)	100/-
الغزالی	200/-	مرتبہ: سید سلیمان ندوی	
المامون	100/-	مقالات شبلی دوم (ادبی) //	70/-
سیرۃ النعمان	300/-	مقالات شبلی سوم (تعلیمی) //	80/-
سوانح مولانا روم	80/-	مقالات شبلی چہارم (تنقیدی) //	200/-
شعر العجم اول	150/-	مقالات شبلی پنجم (سوانحی) //	150/-
شعر العجم دوم	130/-	مقالات شبلی ششم (تاریخی) //	90/-
شعر العجم سوم	125/-	مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ) //	100/-
شعر العجم چہارم	150/-	مقالات شبلی ہشتم (قومی واخباری) //	110/-
شعر العجم پنجم	120/-	خطبات شبلی مرتبہ: عبدالسلام ندوی	80/-
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی	350/-	انتخابات شبلی مرتبہ: سید سلیمان ندوی	45/-
(محقق ایڈیشن) تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی		مکاتیب شبلی اول //	150/-
الکلام	230/-	مکاتیب شبلی دوم //	190/-
علم الکلام	180/-	شذرات شبلی مرتبہ: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	220/-

ISSN 0974 - 7346 MA'ARIF (URDU) -PRINT
AUG 2015 Vol- 196 (2)
RNI. 13667/57 **MA'ARIF** AZM/NP- 43/016
Monthly Journal of
DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
P.O.Box No: 19, Shibli Road, AZAMGARH, 276001 U.P. (INDIA)
Email: shibli_academy@rediffmail.com, info@shibliacademy.org
Website: www.shibliacademy.org Fax No: 05462 - 265080
Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh
Account No: 4761005500000051 - IFSC No: PUNB0476100
(Office Mobile) 07607046300 / 09170060782

تصانیف ومطبوعات شبلی صدی تقریبات

۱۔	سیرۃ النبیؐ جلد اول ودوم (یادگار ایڈیشن)		علامہ شبلی نعمانی	2000/-
۲۔	شبلی کی آپ بیتی		ڈاکٹر خالد ندیم	325/-
۳۔	دارالمصنّفین کے سو سال		کلیم صفات اصلاحی	350/-
۴۔	شذرات شبلی (الندوہ کے شذرات)		مرتبہ: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	220/-
۵۔	الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی		علامہ شبلی نعمانی تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	350/-
۶۔	محمد شبلی لائف اینڈ کنٹری بیوشنس		ڈاکٹر جاوید علی خاں	230/-
۷۔	سیرت عائشہ	(ہندی ترجمہ)	علامہ سید سلیمان ندوی	325/-
۸۔	عرب وہند کے تعلقات	(ہندی ترجمہ)	〃 〃	200/-
۹۔	خطبات مدراس	(ہندی ترجمہ)	〃 〃	125/-
۱۰۔	دین رحمت	(ہندی ترجمہ)	مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی	200/-
۱۱۔	ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، اول	(ہندی ترجمہ)	سید صباح الدین عبدالرحمن	125/-
۱۲۔	ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، دوم	(ہندی ترجمہ)	〃 〃	180/-
۱۳۔	ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، سوم	(ہندی ترجمہ)	〃 〃	225/-